

بلونت سنگھ کے افسانے



بلونت سنگھ

بلونت سنگھ کے افنانے

بلونت سنگھ کے افسانے

بلونت سنگھ

مکتبہ اردو ادب کو

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ - لاہور

جملہ حقوق محفوظ

سرفراز احمد
منظور پریس لاہور
۱۲ روپے

ناشر
مطبع
قیمت

فہرست

صفحہ	
بگا۔۔۔۔۔	۷
کسٹن دگرا۔۔۔۔۔	۳۷
کرنل سنگھ۔۔۔۔۔	۵۴
خوشبودار سوٹ۔۔۔۔۔	۷۴
گن بل پر دم بجم۔۔۔۔۔	۸۹
گھر کا راستہ۔۔۔۔۔	۱۰۰
شکرہ۔۔۔۔۔	۱۰۹
پنجاب سنا البیلا۔۔۔۔۔	۱۲۷

جگتا

ماہی کے علاقہ میں بھین ایک پھوٹا سا اور غیر معروف گھاؤں تھا شکل سے سو گھر ہوں گے، زیادہ تر مکھوں کی آبادی تھی، یہاں کی ایک بات عجیب تھی، وہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طرح پر حسین لڑکی دھوئیں آتی تھیں کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر پردہ مان ہوئی کہ کسی پنوں، سوہنی مہینوال، ہیرا پنچا کے تھے بھی بات ہو جاتے تھے، ادواب کے قزم گز نام کوہ کے نام پر اٹھا۔

گلیم کے حسن نے اس پاس کی بھینوں کے نوجوانوں میں ایک ٹپل سی چا دی تھی، وہ ایک گڑیا کی مانند تھی، چینی کی موت چلتی تو اس بکب رقتاری کے ساتھ کہ نقش قدم معصوم ہر گھٹن اور بدست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آیا تھا، لیکن وہ ابھی معصوم تھی، شباب کی آمد آمد تھی، اودہ ایک بے نکر اور پُر شباب و شیرازہ کی پر نور جس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی، پیسے خاموش اور پرسکون کے میں کہیں دور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے پائے، ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی، وہ اپنی سکرات ہر کسی کو پیش کر دیتی وہ سب سے سنس کہ بہت کریمتی ابھی اس میں پندار حسن پیدا نہ ہوا تھا، اس لیے جو بھی شخص اس سے بات کر

لیتا یہی سمجھنا کہ گزرا اس سے محبت کرتی ہے، ایک مرتبہ تو شنگار سنگھ نے لٹلانیہ
 زبواؤں کے بھرٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گزرا کو بھگائے جائے گا اس
 وقت دلیپ سنگھ اور سرے گھڑا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی
 گزرا کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے، اس نے سن لیا تو ملالت خطرناک صورت
 اختیار کر لیں گے۔ اس پر شنگار سنگھ نے زبردست توجہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے
 کھڑے ہو کر کہا بلا دیا اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اس نے خشکین نظر
 سے شنگھ کے طرف دیکھا، اور کڑاک کر بولا تو نے بھرا کیوں بلایا ہے۔

شنگھ سے نے تہنید کس لیا اور غم ٹھونک کر مقابلہ پر کان کھڑا ہوا دلیپ کی
 آنکھیں قبر و سار ہی تھیں، قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتہ ہائیں مگر سب نے
 ہنچ بھاؤ کر دیا، آخر کہاں کہ ایک خونی پل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا، دلیپ کا ٹخنہ
 اڑ گیا اور دلیپ کی لاش کی ایک ہی ضرب سے شنگھ کے کا جڑا ٹوٹ گیا، جان تو
 بچ گئی، مگر صدمت بگڑ گئی، اس دن سے سب کرمان ہو گئے، اور اب دلیپ کے
 بیٹے ہی گزرا کا دھویلا پیدا ہونے لگا تھا۔

رات بھیگ چکی تھی، پانچ جون پر تھا، گھاؤں پر ایک پراسرار خاموشی ماری
 تھی کبھی کبھی کتوں کے میوہ کھنے کی آواز آتا یا اس وقت ریش کی چرخی کے پاس
 ایک جھگی بلا بیٹھا دم ڈال رہا تھا، اور شبایت اڑناک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا
 تھا۔

یہ زہرٹ ارڈر لوں کے پاس گھاؤں نے باہر کی طرف تھا ساتھ ہی پیل کا ایک
 بہت بڑا اور گھناور وقت جس پر ایک جھولا پڑا تھا چڑک بلیوں کو ہانکتے والا کوئی
 لہ کس کی تھیک کرنے کیلئے منہ کے آگے ہاتھ رکھ رہی تھی کی آواز نکال رہی تھی۔

تھا نہیں، جی پاتا پل دیتے جی پایا معتبر پاتے، اس وقت خاموشی سے کھڑے بیٹھ گئے۔

اتنے میں سائنٹی سولر ایک سکورڈ میل کے نیچے آکر کما اس سے سائنٹی کو نیچے بٹایا پاتا سائنٹی بلکار میل اور پھر وہ پ سے بیٹھ گئی، پنجاب کے دیہاتوں میں چھٹ اور پنچانو جوان کوئی کھلافت معمولی بات نہیں مگر اس مرد کے کاٹھے یز معمولی طور پر چوڑے تھے، متوں اور پھر وہ کی رگیں ابھری ہوئی آنکھیں سرخ انگارہ ایک جیسے حجاب کی چوڑی، رنگ سیاہ چوڑے اور مضبوط جبرٹے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، جوڑے پر رنگ پر رنگ کی بالی جس میں سے تین بڑے بڑے پھندے نکل کر اس کی سیاہ ڈاڑھی کے پاس ٹک رہے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کالے رنگ کی پھٹی مس پگڑی کے درمیان بل سر پر بدن پر لٹا ہوا، اور مونگچا رنگ کا دھاریلا تہنڈا اس کی اڑیوں تک ٹکتا ہوا، گریبان کا تہہ کھلا ہوا کسی کی تعجب کرنے کے لیے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر حین سبت کی آواز نکالتا، اور اس کے سینہ پر کے گھنے بال نمایاں اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور پھلکا پھوسی۔

اتنے ہی اس نے میوں کو دھسکا اور وہ چلنے لگے اس سے جوتے اتارے تہنڈ کو اوپر اٹھایا، اور اپنے موٹے کڑے کو پیچھے ہٹا پانی کی جال کی طرف بڑھا پچھلے اس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانا، اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے ٹیلے سے منہ پر کھینچ لگا، تو ایک نوجوان دو شیرہ کو پیچ کر ٹھٹک گیا، روکی تے پانی بھرنے کے لئے گھوڑا جال کے نیچے کیا، اس کی گدی کائی

پہلے کالی کالی چوڑیاں ایک جہن کی آواز کے ساتھ یک جا ہونگیں گلابی رنگ کی شلوار
 جھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا، سر پر دانی رنگ کی بکلی پھسکی اوڑھنی، کمانوں میں
 چھوٹی چھوٹی بالیاں، جب اس نے اپنا نادرک ہنٹ دانتوں سے دبایا، گھرے کو ایک
 جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر کوچے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دلنشیں غم سا پیدا ہو کر
 رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں آدلو سے باہر نکالا اداس سے جھٹک کر جوتہ پہن لیا پھر اس
 نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتہ بھی پہن لیا، تب وہ اپنی چھری
 اٹھتے میں لیے ہوئے اردوٹی پر جہاں کہ ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے
 کھڑا ہو گیا، پاس ہی کس کے گھر کی کچی دیوار تھی، جس پر اچلے سکے تھے، جب راکھ دینا
 کے قریب گزرتے گئی تو مرد نے چھری سے ایک اڑا لیا بچہ گلا دیا، جو راکھ کے پاؤں
 کے پاس جا کر گرا اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر
 کی بکلی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کیوں
 کو دوند کر چلے آ رہے ہوں لڑکی نے اپنی لابی پھکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھی
 شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا، مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر
 اس کی بڑی بڑی سرگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا، مرد نے
 جھاری بھر کم اور کھرت آواز میں پوچھا، تو کون ہے؟

لڑکی کی نظری مرد کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے
 اسے اس قدر بے مروتی کے ساتھ مخاطب کیا، اس کے سرخ سرخ نازک ہونٹ
 پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرہیں ان پر چھڑک دی ہوں مگر مرد بغیر معمولی طور پر

بھی ایک تھا مرد نے اسی لہجہ میں اپنا سوال دہرایا تو کوئی ہے؟
 لڑکی سمجھ نہ کی کہ اس بات کا کیا جواب دے اس نے اپنی خانی آنکھ اٹھا کر
 اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں۔

مرد نے چھٹی ہوئی ٹھکروں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنے چوڑے شانوں کو
 حرکت دے کر بولا خیر انما کیا ہے؟
 دوشیزہ کا آنکھیں پر آب ہو گئیں، بولی گناہ۔
 تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟

میری ماں ہے بے بے، دیر چایا، بالو پب ہی رہتے ہیں۔
 مجھے اپنے گھر لے چلے مرد نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔
 مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

مرد کی پیشانی پر بہت سی توبیاں پڑ گئیں اس نے اپنی دھڑکنے والی
 سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانت میں قلعہ دم بھینچا کیوں؟ کیا تم لوگ کچھ
 نہیں ہو کید؟

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا، لیکن مجھے تجھ سے خوف معلوم ہوتا ہے
 کیوں؟ مرد نے آجڑ پن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔
 لڑکی نے ایک لمحہ کے لیے اس کی چمک دار آنکھوں کی طرف دیکھا، تم
 جتنے کیوں نہیں؟

ارے یہ بات، یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا جیسے کوئی پانی
 سے لبریز شکار میں براؤٹل دے۔ اس کے قہقہہ کی آواز سن کر چمکا دھڑکیں اپنی

کیس گماہوں سے بھل کر پرواز کر گئیں۔

گز نام گماہر گاؤں سے باہر دھڑک کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا اس کی مٹی تو بیت دور سے نظر آتی تھی۔

دروازہ کے سامنے پہنچ کر اجنبی رک گیا، اندر گز نام نے اندر سے اپنے باپ اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا: واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح؟

واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح؟

اجنبی جو کسی پچکپاٹ کے بولاز میں دور سے آ رہا ہوں، رات زیادہ گزر چکی ہے، میں آج یہیں ٹھہر رہا ہوں گا۔

باپ و رات ہی اپنے پوتے کے اہتسا میں دے کر اجنبی کے سہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور منتشر شخص تھا اگر اجنبی کی بھیا نک شکل اسے شش و پنج میں ڈالے ہوئے تھی، خیر اس نے رہا مندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا میں ہر طرح سے خدمت کے۔

پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پوسا کر کے اجنبی ساٹھنی لٹکے سپرد کردروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کل سامان عزبانہ تھا، مگر گورو سے پی ہوئی کئی دلیاریں اس کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی محدثیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہ تھیں گھر کے سب افراد زیادہ دلے گھر گئے ہوئے تھے، سونے چار کے

ڈیوڈھی سے بھل کر اجنبی من میں داخل ہو گیا ایک بچہ سینہ سے لگی ڈنڈا

لگائے سو رہا تھا، صحن مولشیوں کے موت امد گویا سے اٹا پڑا تھا، ایک طرف
 کھمرل کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی، ہمیں امد کھل کی سانی کی بو ہر چار
 جانب پھیلی ہوئی تھی، رسی پر چلے کچیلے کپڑے تلک پہنتے ایک طرف خواں دوسری طرف
 تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے لٹکا ہوا چکٹ کا پیہر، بڑے بڑے اپنے
 کونے میں کپاس کی چھڑیاں چھلے کے پاس جوڑے برتنوں کا انہار ایک کمرہ میں سے سینہ
 سفید بچتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے، ساتھ تلگے میں پردے ہوئے شلغم
 کے تھے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے،

صحن میں سے گزر کر بیڑھا باپو اجنبی کو مدد دینے سے باز رہ چکے بیچے لے گیا
 صغریٰ اسی جگہ کے مینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھادی گئی تھی، سوکھے ہوئے اچھے
 جوڑنے کے کام میں آسکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے، یہاں پر ایک چلپائی
 ڈال دی گئی، چار ٹالوں والا ایک کہیں اندر اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک
 مدد دیکھ اس پر رکھ دیا گیا۔

گرم لے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور غوا آگوندھنے لگی
 جس وقت وہ تنور میں دھٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھینک گئی
 اس کی لابی چوٹی کے رنگ بنگ کے پھندے اس کی پٹیلیوں تک لک رہے تھے
 دیکھتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرہ پر پڑ رہی تھی اور اجنبی چپکے
 چپکے اسے دیکھ رہا تھا،

شلغم کی ترکاری، ایک کٹھن میں ٹنگ گئی، ٹریوں کا اچار، دوڑی بڑی ہیات

کی گھٹیاں، اور آٹھ چوڑی چوڑی دوٹیاں تھال میں رکھ کر گز نام اس کو دبے آئی،
 حبیبا جہنی نے اور بچے سر میں تین چاندی لیں، مافد بڑے دوشور کے
 ساتھ منہ میں انگلی پھر کر کھلی کی تو گز نام کو مسلم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے،

وہ بہن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کھڑے آثار بیٹے جیاس
 نے جہنبا تارا اور اسے جھاڑ کر میکہ کے قریب رکھنے لگا تو سنے کا ایک
 کنٹھا نیچے گر پڑا، گز نام ٹھٹھک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا
 گز نام! بس جا رہی ہو گی؟

گز نام حسبِ معمول اپنے دلغریب لفظ لاٹاٹنے سے مسکرائی، اور اوڑھنی
 سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی نہ لب لوگ سو جائیں تو میں
 آؤں گی؟

اجنبی دودھ کیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا، شرنیچہ اور ببول کے پڑسیاہ
 دیوڑوں کی طرح خاموش کھڑے تھے، لڈمنڈ بریوں پر بیٹوں کے گھونٹے کھ
 رہے تھے،

ایسے سنان وقت میں تاروں میرے آسمان تھے، کس دور افتادہ رہتے
 کس نوجوان کی سرت انگیز گھٹنے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی،

باگے دھج کیلا ای -

مکل کے ملی بابو!

ساٹے دینچنے داویلا ای

مکل کے ملی بابو!

اتنے میں گزرا مہے پاؤں، شعلوں کے پانچنے اٹھائے، پھلا ہونٹ دانتوں
تھے دبائے، پچکے پچکے قدم تپتی مولیٰ آئی۔
مترڑی دیر بعد دونوں میں گھل کی کہ باتیں ہونے لگیں،

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار بھالے قریب
تھا کہ گزرا مہے منہ سے ہجرت اور مسرت کے مادے کی پچی نعل جاتی مگر اجنبی
نے بونٹوں پر انگلی دکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گزرا مہے بیت دیکھ مینا کی طرح چمکتی رہی، ادا مرد محرم کی باتیں کرتی رہی
مگر اس کا دھیانی زیورات کی طرف تھا، آخر سر اس نے اپنی باتوں سے آپہا
اکا کر ایک گہری سانس ل اور بھکان زدہ آواز میں بولی۔

کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو میرے خیال میں تم جیب کترے
تو نہیں ہو مجھے جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے وہ جھٹ
سے گلابا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں۔ یہ کہہ کر گزرا مہے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے
غلامیں گھومنے لگی، جیسے کوئی صبح صبح کا تاقی اس کا گلاب بنے کو کر رہی ہے،
مت گھبراؤ تم ہم کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو بھلا میرے دوستے جوئے
تم کو کس بہت کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چار پائی پر میٹھا باؤڑ۔

گزرا مہے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی، اس نے اجنبی کے چوٹے شانوں کہلانے
لیا اور پھر گھیا تار دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی، تم بہت اچھے ہو یہ زیورات تو تم اپنی
بیوی کے لیے لائے ہو گئے نا؟

ہاں۔

گز نام نے اپنی سخیلی پر بخار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔
• تمہاری بیوی کیسی ہے؟

• مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔

• اچھا تو ہونے والی بیوی کے لیے لائے ہو۔

اجنبی نے اپنی ڈاڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کیا۔ ابھی

تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی، بیٹھ گی بھی یا نہیں۔

گز نام نے اپنی دونوں سخیلیوں پر عضوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جھپکاتا

ہوئے، ناک فدا کیل کر بھلے پن سے کہا: ان تم کسے خود؟

اجنبی کے سینہ میں جیسے کسی نے گونہ مار دیا۔

مگر گز نام نہایت خنجیدگی سے کس گبری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید

وہ اجنبی کے لیے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

• میری پور تم سے دو۔

گز نام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا، پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ وہ کھڑا قیام سے بولا: پھر میں تم سے لے لوں

✓

گز نام کی آنکھیں چکنے لگیں، اس کی باجھیں کل گئیں، تالی بجا کر بولی میں ان

کو اپوں میں چھپا دوں گی، کبھی کبھی لٹ کو اچھے اچھے زیورات پہن کر کھیتوں

میں ہلایا کروں گی۔

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا گرام تم بھی تو بچہ کو کچھ دے۔
کچھ بھی ہو۔

گرام چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کٹ ٹیول اور خربوزہ کے ڈنگ بڑنگ کے بچوں کا ہار اٹھا کر اجنبی کی طرف بٹھا دیا وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر بھنیپ سی گئی اور اس کے رخسار دیکھنے لگے۔

”خود می دیر بعد گرام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا، میری انگلی میں پینا دو،
دیکھو کیسی گنتی چھڑے۔“

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے پکیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرام کا کون سا ہاتھ لیا گرام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انوکھ کے ساتھ آگوشی کیلرت دیکھ رہی تھی اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارنگل کے نام میں اس کے خوبصورت سپیوں بے ہونٹوں پر نظریں مڑے ہمارے ہمارے عجیب وہ اس کی انگلی میں آنکھوں میں پہنانے لگا، تو اس کی اپنی آنکھ لپاں مڑنے لگیں۔ اور اسے ایسا عسوی ہونے لگا، جیسے اس کی چار چار آنکھ چوڑی کلائیوں کی کل حالت کشید کی جا رہی ہے۔

گرام پونہ کی اور بھی ہوئی ہرنائی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی، اماں کا سنس رہی ہے اب میں جاتی ہوں۔

اجنبی اپنے خواب سے چوہمچا۔

گرام نے آگے جھک کر نفرتی آواز میں پوچھا، جاؤں کیا؟

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زلیخا کی پرٹلی نین میں دبائے جھٹ اندر چل گئی۔

علیٰ صبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوڑ میں گھس پڑے اجنبی جاننے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ گناہ نے اسے ایک باسی روٹی پر تکھن اور چھٹا لسی کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گناہ رونے لگی اجنبی نے آہستہ سے کہا "دو ق کیوں ہو؟"

تم مجھے بہت اچھے گتے ہو تم مت جاؤ۔

اجنبی میس پڑا "میں پھر آؤں گا۔"

باپ کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے

اپلا بیٹی کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا اس

نے اجنبی سے پوچھا کیا میں اپنے عزیز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟

"ہاں۔" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرہ پر گماڑ کر جواب دیا پھر اس

نے اپنی دھوپ میں پھنسنے والے گندھ سے کی طرف فزیزہ اذان سے دیکھتے ہوئے

مزید کہا "اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا،

بیگانے کسی سے بھی کیا تو تیار رہے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے

خون سے مجھے اتنا دلچسپی پڑیں گے کہ

بوڑھے کا چہرہ خن ہو گیا۔

اجنبی ساڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا کے کر اپنی سجاری آواز

میں بولانہ آج رات گھاڈا کو تہاڑا مہمان تھا۔

جگھا ڈاکو اس کی نام سردار جگت سنگھ واک وہ خوفناک شخص تھا کہ جس کا نام
 سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے، قتل غارتگری، غلام
 موٹ مار اس کے حدود کے مشاغل تھے لڑکپن اور شباب خون کی ہول بھیلنے
 میں ہی گذر گیا بہت سی زمین کا مالک تھا بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا
 عزیز خوش تھے، اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص سوصلہ نہ کر سکتا
 تھا۔

تیس برس سے اوپر سن تھا موت کے ساتھ کھینچتا ہوا سو جاتا اور موت
 کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا عجت حسن شہادت، نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک
 کچھ بھی مقدم متعین نہ تھا۔ دوسروں تک اس کی درموم تھی، ملاقات بھراس سے عورتا
 تھا۔

اس کا دل پتھر بازو آہن غصہ قیامت، ذہن شعلہ۔۔۔ وہ قہر تھا۔
 لوگوں نے اس کے نام پر کئی گھاتے بنائے تھے، نوجوان جھوم جھوم کر ان کو
 گایا کرتے تھے ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا۔
 کچے پلے تے لڑائیاں ہوئیاں کچے پلے تے۔
 کچے پلے تے لڑائیاں ہوئیاں تے چھیاں دے کل ٹٹ گئے۔۔۔۔۔ بگیا یا
 پھر لائن پور میں آس تے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا، اور بچ کر واپس بھی
 آگیا تھا، اس کا ذکر یوں ہوتا تھا۔

گجے ماریا لائن پور ڈاکہ جگے ماریا
 گجے ماریا لائن پور ڈاکہ تے ماراں کو کھک گیاں کچے

اس کی طویل تاریک اور پتیلیاں شب حیات میں ایک تارا طلوع ہوا

جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کر دیا، اور وہ تارا مٹا۔ مگر نام !

گرام بپاری نادان چھوکی اُسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا، اُسے لوگ
کنکلیوں سے دیکھتے وہ منس دیتی، اس کے جذبہ پذیر حسن و شباب کو کسی
نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا
کہ دبہہ دانستہ شکار کیلئے سبیلوں کا ترپنا دیکھے اور اس لذت سے محفوظ
ہو جو کہ صیادوں کے لیے محسوس ہے وہ بھولی بھالی سادہ رو چھو کر یہ جانتی
ہی نہ تھی کہ وہ شاہیں جس کو زخمی کرنے کے لئے پنجاب کے شہر و روستوں کی لائن
ٹوٹ پھٹ گئیں اور جس پر جو بھی تیر بھینکا جاتا تھا وہ اسے چھو کر اور کدھو کر دین
پر گریڑتا تھا۔ وہی شاہیں اس کے تیر غلط انداز کا شکار ہو کر غم سبیل اس کے
چہروں کے پاس پڑا تھا، اور وہ تیر قدرت نے اس کی پکوں میں پنہاں کر کے

رکھ بھولنا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدہ سحر کے نمودار ہونے
سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو ایک ستول زمیندار غلام پر کیا، باپ کے
غلادہ گھر کے سبب افراد اس کو دم م سنگھ کے نام سے جانتے تھے گرام کی کشش
اسے کھینچ لاتی ہیں اس کے دل میں ایک غلش سی رہتی تھی کہ وہ اس درشتہ
کو اپنانے سے پہلے خود کیونکر اس کے قابل بنائے اس نے کہیں بھی اس سے محبت
جلانے کی کوشش نہیں کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیونکر اس کا آغاز کرے وہ

سوچتا تھا کہ نامعلوم اس کے اظہار محبت کرنے پر گناہ کیا دعوے اختیار کر لے وہ اس کے پاس کے میٹھ چھپکتی رہتی تھی اور وہ بہت سا بیٹھنا کرتا کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی صورت تو اس کی پیچھے ہی مکر وہ تھی مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا گناہ تھی کہ اس نے کبھی اس سے اظہار نفرت نہ کیا تھا وہ نہایت محبت کے ساتھ اس سے پیش آنے لگا۔

آنے لگا وہ اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی، اگرچہ اس نے آنے تک اس کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی گناہ کی فرشتہ سیرت اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی اسی کا ملکوتی جہاں اس کو سڑنگوں کو دیتا تھا، مرنے اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت سیرت سے سنا کہ

مجھے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔

ڈریجہ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے ہی گزر گیا۔

جگنا بیج دشنام پڑھتا کرتا، غریبوں کو کھلاتا پلاتا، دان کرتا، گوردوارے

میں جا کر سیر کرتا، ہر کسی کے ساتھ نرمی اور ملیں سے گفتگو کرتا۔

اس نے بالوں کی منت کہ گناہ کو ترک شادی اس کے ساتھ کر دی جائے

اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے اور جو کچھ اس نے ٹوٹا وہ سب بڑی تو نہ

والوں کا تھا غریبوں کی کمانی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا وہ اپنی بہت سی

زمین اور دھرمیہ ان کو دینے کو تیار تھا اور بالوں کو وہ ہمیشہ بزدل سمجھ کر اس

کی خدمت کر چکا لیکن گرام کو یہ نہ معلوم جوتے پائے کہ وہ بھگاڑا کرتا تھا اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم جوتے پائے کہ اس کی شادی کس سے ہوتی والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو پاستی تھی اور جب وہ اپنے پر تیم کو ایک بیک اپنا غلام دیکھے گی، تو اس کی ہیرت کی انتہا نہ رہے گی نیک باپ نے سب کچھ منظور کر لیا۔

بھگاڑیگن سے چودہ کوس پر سے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کس کو کانوں کان نہ ہوتی تھی، لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا، مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی، کیونکہ اول تو آتا ہی کبھی کبھار تھا، اور دوسرے وہ راتوں رات واپس بھی چلو جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑس ہوتی معروفتیوں کا بہانہ کر دیتا تھا، بچے کو دنیا جانتی تھی، مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔

بچے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی، اب وہ چاہتا تھا کہ گرام کی زبان سے بھی عشق کا اقرار کر دے، خواہ اسے یہ نہ بتائے کہ اس کا ہونے والا خادمہ وہی تھی۔

ایک دن بہارِ خروب آفتاب وہ بھیکن میں داخل ہوا، مگر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرام سانھ دے گاؤں میں جولاہوں کو سوت منے کے لیے گئی ہوئی تھی۔ بچے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی، اس نے پگڑی کو ذرا کچلے کیا، خند کو ذرا اور بلند کیا، اور پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ میں ست سرسوں کا تیل جمیلی ہوا لیا اور اسے اپنی گھٹی اور کھردرے بالوں والی گرد آلود داڑھی

بد خوب اچھی طرح بل لیا، پھر وہ مونہوں کو بل دیتا ہوا گھومتا باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا، پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔

ہر طرف دھند سی چھائی ہوئی تھی، چاند کی لمبی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

دور سے ایک صورت دکھائی دی، اسے غور سے ٹھٹکی باندھ کر دیکھا کوئی عورت تھی، اور یقیناً وہ تھی بھی گرام

جگا امیل مرغا کی طرح حقہ ڈکڑا رہا گیا۔

گرام قریب آتے ہی مسکرا دی، لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی، سر پر ایک بھاری گھنٹری تھی، "میری تو گردن ٹوٹ گئی۔"

"اس گھنٹری میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے جگ نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر دیا، اس کے سر پر سے یوں اٹھالیا، جیسے کوئی دس سال کے بچے کو ہانگ سے پکڑ کر اٹھا لے۔

"اچھے، اور ہو گیا؟ مگر نام نے اپنی تیلی سی ہانک سکیڑ کر کہا، "آرہی تھی رستہ میں لپے چھنے لگی، یہاں تک کہ شام اسی میں ہو گئی۔"

دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج جگ نے گرام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، اس کے ہاتھ کی پکی ہونی، روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کیے دیتا تھا، کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا مجید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔

آئو کار اس سے باز گیا گر نام کچھ اضرہ سے ہو رہی تھی۔ ”گر نام!“ یہ کہتے کہتے رال اس کی دلاڑی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر ہلا۔
 ”گر نام! تم کو لیک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔“

گر نام نے کچھ جواب نہ دیا وہ اپنے پاؤں کے انگلیٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی۔ اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلی سخی شوخ ادا الحشر نہ رہی تھی، مگر چونکہ بچے سے کافی مانوس تھی۔ اس لیے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔

بچے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔
 ”کیوں گر نام کس سوچ میں ہو؟“

گر نام پہلے تو چوٹکی پھر اس نے دھیرے سے کہا، ”میں بہت پریشان ہوں میں بہت دن سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سناؤں لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”شرم آتی تھی“ گر نام نے جھینپ کر جواب دیا۔

بچہ کچھ کچھ تاڑ گیا۔ ”زیر مونچہ“ مسکرایا۔ ”ارے مجھ سے شرم کیا؟“ گر نام

چپ رہی۔

بچہ کھسک کر اس کے قریب ہو گیا اس کے بار بار اصرار کرنے پر گر نام نے

بتایا ”وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔“

گر نام کی آنکھوں میں آنسو آگئے بھرائی ہوئی آواز میں بول ”وہ کس دیکھ

پہنڈولے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں
مگر میں اور کسی سے ۔۔۔
یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

گجے نے اپنے اوپر کی طرف اُٹھے ہوئے شلہ کو پھوکر دیکھا کہ وہ نیچے
توڑیں جھک گیا پھر اس نے سینہ پھلا کر کیا نہیں گرام، نہیں جس کو تم پا چو
گی اسی سے تمہاری شادی ہوگی میں اپو کو خود سمجھاؤں گا ۔۔۔ ہاں تو ۔۔۔ مگر
وہ ہے کون؟

گجے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔
گراہ نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے آج
اسے اس کے چوڑے شانوں اور منہ پر جیسے سینہ کو چھو کر ۔۔۔ تسکین حاصل
ہو رہی تھی۔

جگا گھبرا گیا، اس نے اس کو پھکلا اور دلا سا دیا اور پھر اس شخص کا نام
پوچھا گراہ نے کچھ کہنا پانا پھر رک گئی ۔۔۔ اور درز در سے رونے لگی گجے نے
تسکین دی تو وہ بولتا تم مزید سی مدد کرو گے، ان سب کے ہاتھوں سے سخت
جیزا ہوں، تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام ۔۔۔

گجے کا دل بیوں اچلتے لگا،

اس کا نام ہے دیپ ۔۔۔ دیپ سنگھ

گجے کو سانپے ڈس یا۔

اس کا چہرہ یکایک مہیا تک ہو گیا۔

۱۔ دلپ سنگھ اس کا نام چہ جگر نام نے دہرایا۔
 بگے کی موہنپیں کھٹے لگیں۔

اس کی پشانی پر تل پڑ گئے جسم کے رونگھے مٹا خوں کی طرح کھڑے
 ہو گئے آنکھوں سے چنگاریاں بجھنے لگیں گردن کی رگیں پھول گئیں جگر نام
 نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

گھر باؤ، اس نے جاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

جگر نام تانت سے بولی:

تم توڑا دلپس علی باؤ، اس نے کرفت ابھی میں گرج کر کہا جگر نام چپ چاپ
 حیرت کے ساتھ اٹھی اور گھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چلی بگا اسی طرح کھڑا ہوا
 تھا اس کا چہرہ لحظہ لحظہ بھینک ہوتا جا رہا تھا، عقاب کی جوتیے ناک سرخ
 ہو گئی آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں اور جہرے سے پر بریت ٹپکنے لگی، مٹا اس
 نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا دانت بچیتے ہوئے آہستہ سے
 بولا۔ دلپ سنگھ؟

موت کا فرشتہ دلپ سنگھ کے سر پر منڈالنے لگا۔

خون پل ملا تہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پل ایک چھوٹی سی ہنر مند واقع تھا ہنر کے دونوں کناروں پر شیشم کے
 بست ہی گئے تیرتے دیاں زقوسورج کی دھوپ پہنچ سکتی تھی اور نہ ہی چاند
 کی پانڈی پل بڑے بڑے اور مسجد سے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا اس کے نیچے

صرف ایک کو مٹی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا۔ رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے مزے ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو انسانوں کو بڑپ کر پینے کے لیے منہ کھولے بیٹھا ہوا جیسے کسی مردے کی دو بڑی بڑی آنکھوں کی چلیاں کو بے زحمت کرکھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا۔ اور کچھ فائدہ پر مرگٹ رات کے وقت کوئی شخص اور صبر سے گزرنے کی برأت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس پل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی نہ خونی پل رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں ادب سے تو دن کے وقت بھی اکیسے اور مرڈا آتے تھے، مشہور تھا کہ وہاں ایک سرکٹ سید رہتا تھا، کہیں کبھی اس کا سرتوپی کے نیچے ولدوز چینی مارا کرتا اور وہ خود بلا مر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گزرنے لگی تھی۔

دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا پھوٹے سے گدے پر دو بوریوں میں سامان تھا وہ سارا کام بھی کرتا تھا اور پنہاری کی دکان بھی اس کی اپنی تیار کردہ گلتند خوب بکھیتی تھی۔

وہ نوجوان تھا خوش رو خوش وضع میں ابھی بیگ ہی رہی تھیں۔

گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل پھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران آنکھیں شربت سے لبریکٹڈ سے مراد اس وقت نگلی باق سے ہوئے تھا۔ اس کا ایک چوڑا سا ٹکڑا نیچے کی جانب نکلتا ہوا اور دھرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا نوز سے خوب بہا ہوا تھا۔

وہ ٹھکانہ صاحب کا میلہ تھا، تنہی کا واقعہ ہے۔۔۔ اور تم تے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے۔

’بے شک میں وہی یوں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دیپ سنگھ تھا، میں تجھے ایک اجنبی اور نوعمر چھوکر سمجھ کر تیرا منہ بٹا رہا تھا، قتل تو میں نے بہت کئے ہیں اسی لپ پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں۔۔۔ اور آج مجھ کو بارہواں قتل کرنا ہے۔‘

دیپ کو اس کے اجڑپن پر تعجب ہوا ہوا، میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے تم تو میرے محسن ہو۔

’تو گرام سے محبت کرتا ہے جو صرف میرے لیے مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے شنگار سنگھ کو اس پہلے سنت زخمی کیا تھا، آج تیرا میرا فیصلہ ہو گا۔‘ یہ کہہ کر اجنبی نے چھوٹی ہاتھ سے رکھی ادا اس کی طرف بڑھا۔۔۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آجائے۔‘

دیپ پس و پیش کر رہا تھا، اس نے کہا میں اپنے دشمن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔‘

اجنبی نے گرج کر جواب دیا: تو بزدل ہے یہ عورتوں کی طرح گلے میں پریشی رومال پیٹ کر گھومتا ادا بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پر خجہ لڑنا کچھ ادا بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے بی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ۔‘ یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا

دیپ کو غیرت آگئی، وہ شیر کی طرح بھڑکیا، وہ ڈنڈا ابروہ گدے سے کھینچنے

کے لیے ہاتھ میں لئے تھا اس نے اس کے منہ پر دس مارا لیکن اپنی تے اسے
 روکنے کی کوشش نہیں کی ولیپ تے دوسری ضرب اس کے کان پر سید کی
 ڈنڈا ٹوٹ گیا اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا ولیپ جوش میں تھا۔
 اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک کداس کے منہ پر سید کیا جس سے اس کا
 جبر اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بکریا گیا۔۔۔ مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ
 کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا اس کی ڈاڑھی کو تر کر رہا تھا
 ایک کان کا اور پر والا حصہ ٹوٹ کر نکلا رہا تھا۔ اور اس میں سے خون کی دھارا
 چھٹ رہی تھی منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیاںک
 ہو رہی تھی۔

مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔

پھر اس نے ولیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور جلدی
 آواز میں کہا: اس طرح نہیں، ولیپ! تم ابھی عرض بچے ہو۔ لیکن گجکا کو لُ مفلالت
 حرکت نہیں کرنا پاتا۔

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبر اسیں اسلی جگہ
 پہا گیا۔ ولیپ جگے کا نام سن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔
 اجنبی اپنی چھوٹی پکڑ کر بولا: تیرے پاس چھری ہے؟
 نہیں۔

تلوار ہے۔

نہیں،

منات جگ؟

نہیں،

مگر لامٹی تو یہ وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی،

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا،

”جا“ اجنبی نے پکار کر کہا۔ لامٹی نے آہ میں نے تیرے کہ تو علاقہ بھر میں

سب زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت
تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ دے گی۔

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالانا پڑا تھا،

جگتے بھوکا آتا کہ علیحدہ رکھ دی اور مرث لامٹی اٹھالی اور وہ دونوں

ایک دوسرے کو دھکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی دھکاک کی آواز سن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑپھڑاتے گئے گڈو

تے ہوا ہوتا ہوا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نہلاتے لگی،

لامٹی سے لامٹی بچ رہی تھی دلیپ دھکاک چھٹ چاکٹ نرا موزاں فریون

چھو کر ابلی کی طرف بے چینی جوتڑ جوتڑ ہمارے بگ بگلی بھرم قری بیسکل کہتے مشق دیو۔

باوجود مٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب

پر ٹھیکر کی پھسلتی ہوئی لہلہا جا رہی ہو۔ دلیپ نے دائرہ لگا کر پہلا وار کیا، جگتا اسے خال

دے کر پٹایا، ایک۔

دلیپ نے تیسرا طرک کیا جگتا اسے بچا کر گر جا، دو۔

کردار کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھٹی اٹھائی اور دلیپ کو پیٹ پر
لا کر کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے پچیس دن بعد!

ریہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے خصوصاً سردیوں میں تو لوگ
فرما اپنے گھروں میں گس بیٹھتے ہیں۔

گزنہ کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر بڑے کمرے
میں بیٹھے تھے، عورتیں چوتھ کات رہی تھیں، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے
اور بچے خزانوں میں مصروف
اتنے میں کچھ اندر داخل ہوا۔

شاید فیضانِ برسی کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھوں میں چھٹی چمک
رہی تھی سب نے اس کو دیکھ کر انبارِ سترت کیا۔
گزنہ ہجرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی بے بے نے اسے بیٹھنے کے
لیے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی ڈاچی باہر کھڑی تھی اور اسے جلد ہی واپس
جانا تھا۔

چند لمحوں کے لیے اس نے سکوت کیا پھر اس نے نہایت مختصر اور فیصلہ
کن انداز سے کہا شروع کیا میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لیے
آیا ہوں کہ آپ گزنہ کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو
سکتی بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس کے کہ میں چاہوں گا۔
سب لگے حیران تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گزنہ کا بیوی والا قادیانہ

خود ہی تھا مگر چونکہ انہیں یہ بلا پوشیدہ رکھنے کی سخت ناکامی ہو گئی تھی، اس لیے وہ خاموش رہے۔

..... اور وہ شخص یہ ہے یہ کہہ کر اس نے دواڑہ کی طرف دیکھا اور واپس
اند داخل ہوا۔

ہر شخص پر میرٹ زاناموشی طاری ہو گئی۔
گنہگار نامعلوم کس دنیا میں پہنچ گئی اس کو شرمانا چاہیے تھا مگر وہ اٹھ
کر اس کے قریب آ گئی۔

جگے نے دیپ سنگھ کے کان میں کیا، مگر گرم کو بھڑے محبت ہوئی تو تم آج
زندہ نظر آتے، دیپ! تم مرد ہو میں نے ابھی طرح سے تم کو آزمایا دیکھا
لیا ہے، میں چاہتا تو تم کو قتل کر داتا مگر مردوں سے مجھ کو محبت ہے، اب جب
کہ تم باری گرام تیار سے پھر دو کہ ابوں امید کرتا ہوں کہ تم میرا بلا ظاہر نہ کرو
گے۔

دیپ نے لشکر آمیز نظروں سے اپنے غصے کی طرف دیکھا۔

جگا بلند آواز میں بولا، باپو! ہاں!! ہے ہے!! میں ان کی شاہی کے لیے

مزدت سے بھی کہیں زیادہ دیر دے گا، اور ان کو بہت سی زمین دیں گا!!

باپا اصل تھک جاتا تھا، لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دیپ زندہ

بچ کر ہو گیا، مشہور ہو چکا تھا کہ دیپ کو ڈاکوؤں نے غولی پل پر قتل کر دیا تھا، یہ

نے فضا گھبرا کر سن لیا کہ غولی پل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا تھا، اس رات

میں وہ سخت ڈر رہی ہوا، اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے اہم قتل ہو جائے کہ سرور

دعوم گنگو دہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر تندی سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے ہچکے
 پھوٹ گئے۔ اور ان کو بھاگتے ہی بن پھردہ اس کو اپنے گھرے گئے اور تیلداری
 کرتے رہے۔

بجے کی مونچھوں کے نیچے اس کے بوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی گرنا
 کی آنکھوں میں آنسوؤں آ گئے۔

وہ سمجھ ہو کر آگے بڑھی اس نے بجے کا بعد ا تھا اپنے کنول ایسے ہتھ میں
 لے لیا پہلے اس نے بجے کے بننے سے اس کے خیز مہولی طہ پر چوڑے شادوں
 کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آنکھیں بولی تم کہتے اچھے ہو۔۔۔ تم
 یہیں پیارے پاس ہی رہا کرو۔

قریب تھا کہ بجائیں مار مار کر رو پڑے مگر جلدی سے گچھڑی کے شعلے میں
 نہ چپا کر بجولے کلرچ دواڑہ میں سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی۔
 کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گرام اپکے ساتھ گھر سے باہر کیے کانٹوں کے
 پاس کڑی مٹی بنا دہرے غما ساٹھا کچھ سا بڑی سوار نمودار ہوئے ان کی بھی
 سبائی ساٹھ نیاں، مردانہ اور دیکھ کر صد تیں پہنکتی ہوئی چھوڑاں، عجب خطر پیش کرتا
 تھیں۔ ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چٹا پچھلا شخص تھا، گرام اسے دیکھتے ہی چلا آئی
 باپ اور کون لوگ ہیں یہ سب سے آگے والا شخص تو دعوم گنگو دکھائی پڑتا ہے۔

نہیں بیٹی نہیں، وہ دعوم گنگو نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر مینہ سے لگا
 لیا۔ اور پھر بیل کے دھنوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں

کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا: آج جگاڑا کو ڈاکہ ڈالنے
کے لیے جا رہا ہے۔

کھٹن ڈگریا

رکھی چند دکان سے واپس آ رہا تھا۔ صدمت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس
 وقت کوئی مزے دار بات سوچ رہا ہے، ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی چلتے
 چلتے جب اسے گھریٹ سدکانے کی خواہش محسوس ہوئی تو اسے خیال آیا کہ ماہیس
 تو دکان ہی پر رہ گئی ہے خیر کوئی مضائقہ نہیں اب وہ گھر کے قریب پہنچ چکا ہے ،
 وہ اپنی دھن میں اس قدر مگن تھا کہ اسے گھریٹ منہ سے نکالنے کا خیال تک نہ آیا کسی
 روگیر کی نظر اس کے ڈھیلے ڈھالے ہونٹوں میں پھنسے ہوئے گھریٹ پر جا پڑی تو
 وہ بے اختیار مسکرایا۔ اس پر فرزد کہ وہ خود بخود مسکرائے جا رہا تھا کہیں سر کو حرکت
 دینے لگتا کہیں زبردب کچھ کہنے لگتا۔ وہ بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا لیکن وہ
 پاگل نہیں تھا چونہیں پنتیس برس کے قریب عمر صدمت ہی بری نہیں تھی صحت کھانی
 اچھی تھی تین بچوں کا باپ تھا گیارہ بچے دکان پر جاتا اس کا سامان پہلے جی سے موجود
 ہوتا تھا ایک سے دو بچے تک پہنچے کیسے دکان نہ دیکھ دی جاتی، شام کے پانچ بجے کے
 قریب وہ گھر چلا آتا البتہ دکان سات بجے تک کھل رہی تھی آٹ کدو ہار کے سطلوں میں ایک
 شخص کو ملنے کے لیے اسے وصل جانا تھا اس نے اپنی بری شان کو سامان یاد کرنے
 کے لیے بھی کہا دیا تھا لیکن اب تک دکان پر اسے ٹھہرنا کہ کل وہ شخص خود لا ہوا ہوتا ہے

سے پہلو سفر کی مصیبت سے جان چھوٹی لیکن آج شام کا پرسوں کا کیا ہو یہ سوال خواہ مخواہ اس کے ذہن پر ابھرتا اور وہ چند لمحوں کے لیے سبب اس نگر میں غلطیاں دلتا اور پھر دل کی پکار خود بخود واضح ہو گئی کہ یہ شام اپنے دوست ریچ نامتھ کے ہاں گزاری جائے بلکہ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا جائے۔

کچھ دنوں سے نہ نامتھ کی بیوی کا سنی اس کے لئے خاص کشش کا باعث بنی ہوئی تھی۔ یہ بات اخلاق سے گری ہوئی غرض تھی لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ جوانی کے نمائندے وہ حد سے زیادہ مغربا بازار زندگی کا شہرناز کسی سے محبت کی چنگیں بڑھانے بغیر گزرتا گیا۔ جب شادی ہوئی تو چند سال تک وہ بیوی کا دیوانہ ساربا۔ مگر رفتہ رفتہ بیوی میں کوئی کشش باقی نہ رہی۔ جب کبھی بیوی آنکھوں کو جھلی معلوم ہوتی تو بس ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی۔ وہاں انکار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ اپنی بیوی بے دس معلوم ہونے لگی۔ اور اس نے بازار حسن کا رخ کیا۔ وہاں دلال بھی لکھا کر سس صاحب بنتے بھرے بازار میں بیٹھنے لگی ہے۔ پہلے پہل تو یہ خیال ہی کہ کچھ کم لذت انگیز نہیں تھا۔ لیکن جب دلالوں کے جھکنڈوں کا علم ہوا تو طبیعت بگڑ گئی۔ دنیا کا دھنڈا قویاً رہا لیکن محبت کی پیاس کے مارے دل میں ہر دم کا شامسا کھٹکنے لگا۔

گزشتہ دنوں بازار کے روز وہ اپنے مکان کے سامنے چوتھے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس نے بیچے نامتھ کو کامنی کے ہمراہ اپنے قریب آتے دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہونے پر بیچے نامتھ نے کہا: ہم اجنبی ہیں۔ مکان تلاش کر رہے ہیں۔ کیا آپ ہماری مدد کر سکیں گے؟

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے بڑی دھڑدھوپ کے بعد اچھے مکان دلوایا

اگرچہ ان کے مکانوں کے درمیان میل بھرے کم فاصلہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود دونوں گھرانوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا، دکھ سکھ میں شرکت کرنا، کبھی کبھار تفریح کی غرض سے شہر سے باہر چلے جانا ان کے معمول میں داخل ہو گیا تھا۔

ایسے موقعوں پر کامنی اس کی طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھ لیتی، پہلی مرتبہ تو اس کا سلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سمجھا کہ اس کی نگاہوں نے دھوکا کھایا ہے، لیکن پھر جب دلِ دلی سکڑا ہٹوں کا تبار بھی ہونے لگا، تو اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ ایک دوسرے سے محبت کر سکیں گے۔ کبھی کبھی اس کا دل لسن طعن کرتا، لیکن پھر وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر ڈھارس دے لیتا کہ کامنی ہی کی طرف سے تو آغاز ہوا ہے۔ کبھی سوچتا، منول دل لگی ہی تو ہے، ذرا کی ذرا چہل چو جاتی ہے، دل بہلا رہا ہے، اس میں قہاحت کی تو کوئی بات ہی نہیں، لیکن یہ سب ظاہر داریاں تھیں کیونکہ دل کی گہرائیوں میں وہ اچھی طرح محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے کامنی سے محبت ہو گئی ہے۔

داسندھ پلٹے پلٹے وہ کامنی کی بابت سوچتا رہا، ابھی تک اس نے اسے چھوا، لمبک نہیں تھا، شاید یہ آج کوئی اہم واقعہ پیش آئے، لیکن ہے کہ وہ اس پہلی جبرہ کے بہت قریب پہنچ جائے، اب وہ اپنی لگی میں پہنچ چکا تھا، جیسا بچہ لڑکی کی دکان اس کے مکان کے قریب ہی تھی، دکان کے قریب سے ہو کر گزرتے وقت سلگتی رہی دیکھ کر اسے سگریٹ سلگنے کا خیال آیا، اگر کوئی دوست اسے ملنے کے لیے آتا تو گھر والوں کو خبر ہو یا نہ ہو لیکن جیسا ضرور اس بات کا خیال رکھتا تھا، چنانچہ سگریٹ سلگا کر اس نے بیاسے پوچھا۔ "کیوں بے بیجے اچھے کوئی شخص ملنے کے لیے

تو نہیں آیا تھا۔

اس وقت جیسا سوار سو گھوڑا تھا، چھٹیک آنے ہی کو تھی، اس لیے منہ سے جواب نہ دے سکا کہیں اثبات میں سر ہلا کر کہیں نفی میں، آخر معلوم ہوا کہ کوئی شخص نہیں آیا تھا۔ رکھی نے سگرٹ کا کش کھینچا اور گھر کی طرف بڑھا۔ دروازے کے آگے جو زمین میڑھیاں بنی ہوئی تھیں، ان کی دواڑیں اکھڑ گئی تھیں ہر دم ان پر سے پھسلنے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا، اسے کئی مرتبہ خیال آیا کہ ان کی مرمت کروادی جائے، لیکن لاپرواہی میں یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

گھر کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ خانہ بڑے آئینے کے سامنے میٹھ بال بندھی ہے۔ معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی ٹیکر آئی ہے۔ اس وقت خاص پہیلی دکھائی دے رہی تھی، اس کے دوست کیا کرتے، تمہاری خدمت تو بہت حسین ہے، پھر بلنا دلوں میں ادھر ادھر دیکھ کیوں کہلاتے پھرتے ہو؟
خانہ نے بال ایک اللہ سے گھما کر آگے لاتے اصرار پر نگاہ کرتے ہوئے کہا
جی میں نے آپ کا سامان تیار کر دیا ہے۔

• بھی آج تو میں نہیں جاؤں گا :

• کیوں؟ خانہ نے تھب سے آنکھیں پھیل کر پوچھا۔

• جس شخص سے ملنا تھا، وہ خود کل یہاں آ رہا ہے، مل بند تو نہیں ہوا، قدرتاہوں

وہ غسل خانے میں چلا گیا اور وہاں "کا کردوں تو سے الفت ہو گئی۔۔۔۔۔ ہو گئی۔"

گٹار باب کھڑے بن چکا تو بیوی نے پوچھا: اب کھانا کھکر ہی باہر چلیے گا۔

• نہیں بھی مجھے دیر ہو رہی ہے، ایک شخص سے ملنا ہے۔ کھانا باہر ہی کھاؤں گا۔

انتظار میں مت بیٹھ دینا۔

حالا کہ اس کی بیوی کو اس پر کسی قسم کا شک نہیں تھا لیکن اس نے بیچ ہاتھ کے گھر کا ہمہ بدن بوجھ کر نہیں لیا۔ آخر کیا فائدہ، عورتیں وہی تو ہوتی ہیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے اس نے اپنی صورت کا جائزہ لیا۔ اور اس کے غور سے فیصلہ کیا کہ اس کی صورت بیچ ہاتھ سے کہیں بہتر ہے اور اگر کامنی اسے اپنے طور پر ترجیح دیتی ہے تو اسے اس کی خوش ذوقی کا ثبوت سمجھنا چاہیے۔

خوب بن ستور کا اس نے اپنے آپ پر آخری نگاہ ڈالی۔ کوٹ کی اوپر والی جیب میں رنگین رومال ٹھکانے سے رکھ دہ رخیلوں پر ہاتھ پھیر کر ان کی پوری کا جائزہ لیا۔ ان کی گروہ درست کی بیلون کی کریم پہنچا دیا۔ پیل کر دیکھی۔ ہیٹ پر بھی ہوتی گرد کی بلدیک جس پہنکی بجا۔ بجا کر صاف کی چاندی کا سگریٹ کیس جیب میں ڈالے ہوئے اس نے ایک نظر سچی کی طرف دیکھا۔ آن ہی واقعی صحن دکھائی دے رہی تھی۔ دوتل لٹ کے نام کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بیوی کو پارک لے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ لیکن وہ ملہی میں تھا۔ اس لیے چھڑی گھماتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ ایک لمبے کے لیے اسے خیال آیا کہ اگر وہ سگریٹ کیس میں عبداللہ کے سگریٹ رکھ لیتا تو بہتر ہوتا۔ وہ عبداللہ سگریٹوں کا بڑا عمارت تھا۔ اور انہیں خصوصاً اس وقت پیتا تھا جب وہ خوش ہو۔ اب سگریٹ لینے کے لیے واپس ہونے میں اس نے بیگانگی سمجھی۔ اس لیے کہنے یادی کی طرف بڑھتا ہوا چلا گیا۔

اس کا دل مسرور تھا۔ قدم بڑے بانگین سے اٹھ رہے تھے۔ اور گردن کی پیزی اہلی اور نئی نئی سی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے ہر چیز نے نیا جنم لیا ہو اس میں کچھ نئی اور حرکات سے چلپا پن عیاں تھا۔ اپنی بیوی اور گھر سے دور وہ اپنے آپ کو آزاد

پرمندے کی طرح ہلکا سا کھمکھم کر رہا تھا۔ وہ کانٹا کے اس چھوکے کے مانند دکھائی
 دے رہا تھا، جو گھر سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوا ادیب والدین کے روپے سے
 عشق لڑا رہا ہو۔ محض محنت کی حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی وہ تو محبت کا ہلکا
 تھا۔ درویش کا خواہاں تھا۔ اصل چیز تو وہ، پیر پڑ گیا تھی، بھوکو کے لیے شوس کر رہا تھا۔
 وہ دل ہی دل میں کامنی کو پیار سے کوکبا کرتا تھا، اس کی یہ ایک تنہا تھی کہ اگر ان کی
 محبت پر وہ ان چڑھے اور دونوں کے دمر کتے ہوئے بیٹے کسی روز مل جائیں تو وہ
 اسے پیاری کوکبا کر بلائے، کبھی کبھی جب وہ تصورات کے طمس سے بھلا تو سوچتا
 کیا معلوم اس کے نصیب میں حسین کامنی کی محض سکرابٹ ہی کھیں ہو؟

آخر نام کے دھند کے میں جب بیچ آئے گا بلا پستر کی ایٹوں کا بنا ہوا مکان نظر
 آنے لگے، تو اس کے قدم ڈمگ گئے۔ یہاں تک تو وہ ایک مبہم لیکن سکھانے والے
 کے ماتحت چلا آیا تھا لیکن اب وہ سوچنے لگا کہ اسے ان کے گھر میں کس امانت سے داخل
 ہونا چاہیے، اس مسئلے کے کئی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ ان
 معاملات پر زیادہ تجویزیں سوچنے کی ضرورت نہیں، ہر حرکت بے تکلفانہ ہونی چاہیے۔
 چنانچہ وہ بڑی بے تکلفی سے ان کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

بڑے کمرے سے میاں بیوی کے رٹنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی
 دے رہی تھیں۔ رکھن صوفے میں جا کھڑا ہوا، بیچ آتا تھا پاؤں پھیلائے کرسی کے
 بازو پر بیٹھا تھا۔ اس نے سنے پکڑے پہن رکھے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاید
 وہ باہر ہانے کی تیاری کر رہا تھا، کامنی اس کی قیض میں ٹھن ٹھن رہی تھی، اور وہ
 گار رہا تھا۔ بیوی بگڑ رہی تھی، اب ذرا گاؤں نہ کر دیجیے نا، سونے چھاتی میں اتر جائے

گی تو پھر دیکھیے گا۔

شوہر سترے پہاڑے بلا دم سے نہیں کہیں گے تو اور کس سے کہیں گے مائی ڈرلنگ
اور ہلا کون ہے۔ اور پھر وہ نہایت بڑبڑاتے انداز میں ہنسنے پہلے پھلا کر مشکتہ
بانس کی سی آواز میں کہیں فرسودہ سا غلی گھانا گانے لگا۔

تیرا کون ہے۔

کسے کرتا تو پیر پیر پیر

تیرا کون ہے۔۔۔۔۔ تیرا کون ہے۔۔۔۔۔ ہاں تیرا کون ہے۔

ادھر میاں بیوی میں یہ چلبلیں ہو رہی تھیں۔ ادھر چھپلاہ کا بچہ پالنے میں پڑا
رود ہاتھ بطلوم ہوتا تھا کہ بیچا تھا اس وقت بڑے خوش گوار سوڈ میں تھا۔ جوں
جوں بیوی اس کی حرکات سے چلتی توں توں وہ اسے اور زیادہ پریشان کیے جاتا
وہ بھنبھلا کر کہتی: اب تنگنا بند کیجئے بنا رو رہا ہے۔

رکھی دام دوہم آگے بڑھا اور اس نے کھانس کر انہیں اپنی آمد سے مطلع کر
دیا۔ بیچا تھا نے سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا پہلے تو حیران رہ گیا، پھر پٹایا، بول بولایا: یار!
میرا خیال تھا، اب تک تم گاڑی میں بیٹھے ہو گئے۔

دکھن تے مٹانے کے لیے اٹھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا: نہیں بھئی۔
دہلی جانے کا پروگرام منبوج ہو گیا ہے۔ کہہ دام سے ملتا تھا اس کا تارا یا ہے کہ کل
فہ خود لا ہو رہے تھے۔

اسنے میں کامنی نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر ہنستے کر دی: جی ہنستے! اس نے بڑی
مستحیبت اور اخلاق سے جواب دیا۔

منارو رہا تھا۔ کاشی اسے پیار سے پالنے میں سے اٹھا کر چپ کانٹے کی گوشش کرتے
 لگی، منا کیوں رو رہا ہے؟ ہمارا منا کیوں رو رہا ہے؟ تا، تا۔۔۔ کیوں ہی آپ کی منی بھی
 رو رہی تھی؟

”جی نہیں، رکھنے نے چوب دیا: ہماری منی تو سولی پڑی تھی، آج کل ہمارے گھر
 میں بچن کا شور بہت کم ہوتا ہے، گوشش اور جویو دونوں انا کے اں گئے ہوئے تھے بچے
 ہیں نا، جی بگر اں کا دل بھی بھلا ہوا ہے، گھر میں بچہ لای منی سے سوچ چپ پڑی رہتی
 ہے۔“

”نا ہی تا، ہمارا منا جی تو نہیں رہتا، کاشی نے بچے کو پکارتے ہوئے کہا: آج تو اس
 کے ابو کے لئے اسے ملا کر مکان کر دیا ہے میں ان کے شن ٹھک رہی تھی اور یہ دل دل
 کر گاتے باتے تھے، منا جاگ اٹھا اور رونے لگا۔“

جب وہ باتیں کر رہی تھی تو رکھی اس کے پکلیے جسم اور تیزی سے ریتے ہوئے ہونچو
 کی طرف دیکھتا رہا، اس وقت صبح و صبح کا تو کوئی سوال نہیں تھا، لیکن سولی گھر لٹو
 لباس میں بھی وہ کس قد حسین دکھائی دے رہی تھی، اور پھر رفتہ بہ رفتہ کچھ خیال آیا تو
 بیخ ناقد سے غلاب ہو کر بولا یا رسولم ہوتا ہے کہ تم باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے، میں
 توروں ہی اور حراٹا آیا، اگر تم کسی کام سے جا رہے تھے تو چلو۔

”جیس یا ربیشو، باتیں کریں؟“

”نہیں جیسی مجھ سے؟ نہ ہوگا۔“

کاشی نے بچے کو گود میں بھلاتے ہوئے کہا: آج ان کی دعوت ہے کہیں؟

”واقعی، مجھی واہ، اب تو میں تیار راستہ نہیں روکنا چاہتا ہر صبا دوسکھف کی ضرورت

ہی کیلئے؟

”نہیں اب میں نہیں جاؤں گا۔ تم اتنی دوسے آئے ہو اب تو مل کر باتیں کریں
مے اور ہاں جیلانی کے ہاں برہن کھیلنے کیوں نہ چلیں؟“

لیکن رکھی کھا پنی حرکت بہت نامناسب معلوم ہو رہی تھی۔ بیچ بھائی اپنا پروگرام
خراب مت کرو۔ میں تو یوں ہی چلا آیا تھا، بس اب سیر کرتے ہوئے گھریاؤں گھارے خدا بند
تیزی کہات ہے کہ میری وجہ سے تمہارا میزبان پریشان ہو اور ہجرم دونوں میں بھگت
بھی تو نہیں ہونا چاہیے۔

بیچ اتھ چڑھو! مل کر چپ رہا، ہجر جیلا: اتنی دوسے آئے ہو، ہم دونوں کا وقت خوب
کٹ سکتا ہے ہاں یا ایک اور بات سوچی ہے مجھے تم یہیں بیٹھو اور میں تمہا کھا کھا کر نیا وہ
ایک گھنٹے کے اندر واپس آ جاؤں گا میری دلہن کی تم کھانا بھی یہیں کھا لو گے اور ہجر ہم
جیلانی کے ہاں چلیں گے، بڑا مزے کا شخص ہے گپ بھی مارے گی اور برج بھی کھیلے گی۔
دکھی کا دل اچھل کر جیسے ملتی میں آ کر ایک گھنٹے کے لیے وہ اور کا سختی تنہا رہ جائیں
مجھے گودی کا سنا تو سو ہی جائے گا، اس سے بڑا چار سالہ لڑکا بھی سلا یا بابا کہے گا، اس نے تیری
سے اپنی ہوئی بھاکا کا سختی پڑا لی گنا گوں سب بات کے جوہر میں وہ کچھ بول سکا۔ بیچ
نا تھ کرنا چلا گیا، کہو یا کیسی رہی، بھی کہیں جانا نہیں، جہیں میرے سر کی قسم! میں بہت
دور نہیں جا رہا ہوں یہی اپنے ڈاکٹر شرابی کے ہاں تو دعوت ہے تم شاید نہیں جانتے
اجنیں، تمہارے راستے ہی میں تو مکان پڑا ہے اچھا تو وعدہ کرو تم نہیں جاؤ گے
نہ ہو کہ میں بیگم بھاگ واپس پہنچوں اور تم غائب ہو جاؤ بس آج شان دار پروگرام
رہے گا۔“

رکھی چپ چاپ کھڑا رہا۔ بھلا کیا کیا جاسکتا تھا، اسے یقین نہیں آتا تھا کہ
تقدیر بھی اس قدر اچھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک موزیم سی امید پر یہاں آیا تھا اور جھگڑا
نے سبکدستی کی پرارتنا قبول کر کے خود اپنے ہاتھ سے اس کے راتے کا کاٹنا عاف کر
دیا۔۔۔

لوہ سے سگریٹ اور یہ ہارنگل رکھو! انہیں روٹی کھلا دینا۔ خدا خیال کتنا۔
جھاگ نہ جائیں کہیں، میں جگنی بجاتے میں آیا نہ
یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی پتھروں کے مٹن لگنے لگا۔ برش سے بال ہوا کیے،
ٹٹائی کی گڑھ دھیل کے کے اٹھنا پلٹنے چھے اوپر کیا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھا تا ہوا بارہ والے
دروازے کی طرف بڑھا۔ کامٹی پکار کر بولی۔ اے کیسے بھاگے جا رہے ہیں۔ گھر
سے باہر جانا ہو تو پاؤں زمین پر گتے ہی نہیں۔ اب جلدی لوٹ آئیے گا۔
ہاں بھی لوٹ آؤں گا۔ لوگ ہمارا اندھن اٹھا اٹھا کسے جاتے ہیں۔ اس کی ٹکر
کیا کرو۔ ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لو۔ اچھا یا میں چلا۔

ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے کامٹی بیٹھک کی کھڑکی کے قریب الجھڑی ہوئی۔
ایک مرتبہ پھر شور ہرے آنکھیں چل رہی تھیں شور ہرے ہوا میں ہاتھ بند کر کے ملا دیا وہ
وہاں چپ چاپ کھڑی اسے گلی کے کھٹ سے نمائے ہوئے بوئے دیکھتی رہی۔ اس
اتنا میں رکھی بھی چپکے سے دیوار سے گم کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک کامٹی
سنان گلی کی جانب دیکھتی رہی پھر اس کا ہاتھ اوپر اٹھ کر بھلی کے مٹن کی طرف
بڑھا اور دوسرے لمحے میں بھلی کا باب بھج گیا اور فرش پر گھٹی ہوئی وہی پر کھڑکی میں
سے آتی ہوئی چاندل پھیل گئی۔

کو ذرے کی طرح آگے بڑھا اس کی کمر بانڈوں میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچا تو
 اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے پھولوں کی نازک ڈال پکڑ کے جھنجھٹا دی ہو
 اس کا جسم سر سے پاؤں تک کامنی کے دم اور چمکے جسم کے لمس سے محفوظ ہونے
 لگا ایک شدید اور قوری ہنسلے کے تحت اس نے نہ معلوم کس کس طرح اسے بھیچا
 چھوہا اور پھر لٹکے کی پکار کی آوازیں بھونڈوں کے دھمکوں کی طرح سنائی دینے
 لگیں اور پھر کامنی اڑتی ہوئی خود شبنم کی طرح آس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔
 وہ کمرے میں تنہا کھڑا رہ گیا کھڑکیوں میں داخل ہونے والی چاند کی روشنی میں
 کمریاں، تپائیاں، تصویریں، پردے اور کتا ہیں، طرز ہر شے خواب ناک اور ساکن،
 دکھائی دے رہی تھی صرف اس کی آنکھیں اور بانڈ لڑاں تھیں، سانس تیزی سے
 چل رہی تھی، بغیر لاری طرہ پر اس کے بھولے سے چند خیز بہم ہی آوازیں بھل گئیں،
 کچھ دیر تک وہ غلامیں گھور گھور کر دیکھتا رہا، ایک مرتبہ احساس گناہ کی شدت سے
 کانپ بھی اٹھا لیکن صرف ایک لمبے کے لیے پھر اس نے دوسال سے مزہ اور پیشانی مشا
 کی کپڑوں کی سلوٹیں اور کوٹ کی جھول کھائی ہوئی آستینیں کھینچ کر ہوا کرکیں، پھر
 دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا صحن میں باورچی خانے کی جانب بڑھا، کامنی چوہے کے
 قریب بیٹھ رہی گئی میں جھج چلا رہی تھی اس کا بڑا روکا اس کے گھٹنے کے ساتھ لگا ہوا اونگھ
 رہا تھا، وہ چوہے میں پاپاتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں کامنی کے دھکتے ہوئے
 چہرے کی طرف دیکھتا رہا ابھی کشتہ کش میں کامنی کے بال پریشان ہو گئے تھے،
 گال مڑخ ہو گئے تھے، قیض دو تین مقالات سے مسک گئی تھی، یہ سب اس کی دست
 درازیوں کے نتائج تھے، اس خیال سے وہ ایک نئی لذت کے احساس میں گم ہو گیا۔

بظاہر کامن اُس کی آمد سے بے خبر و کھال دیتی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف
 رہی بچے کو اوندھکتا ہوا دیکھ کر اُس نے کہا: چلو تھیں ملا دوں امداد سے ملنے کے
 لیے اندر چلی گئی۔

رکھی چوٹے کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں ملاقات کا بارشہ
 لینے لگا۔ کامنی پھر چوٹے کے قریب آ بیٹھی اس کی حرکات سے کسی غیر معمولی واقعے
 کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ دیکھی چوٹے سے انداز کر اُس نے تو ارکھ دیا اور آٹا توڑ کر
 پیڑا بنانے لگی اور اس سے آنکھیں ملائے بغیر لمبی آپ کو سروی لگ رہی ہوگی۔۔۔
 چوٹے کے قریب آجائے نا۔

۱۔ فاقمی سروی جیت سخت پڑا رہی پڑے کہ کہ اس نے اسٹول کھسکایا اور
 چوٹے کے قریب آگیا۔

رکھی کی نظریں اس کے رخساروں، آنکھوں، تیزی سے جنبش کرتے ہوئے
 ہونٹوں اور ہاتھوں کی حرکات پر جمی ہوئی تھیں رکھی دل میں وہ بے چین تشنگی پڑی
 شفقت سے غسوس کر رہا تھا جو پیاسے ہونٹوں سے شربت کا گلاس پر سے بیٹ
 جانے سے غسوس ہونے لگتی ہے کامنی نے روٹی اٹھتے ہوئے کہا: آپ کو بھوک
 تو لگ رہی ہوگی نہ

اُس نے اٹھ کر کامنی کے رخسار پر ہونٹ رکھ دیے: نہیں کو! مجھے بھوک
 نہیں لگ رہی، یہ کہہ کر وہ اسے اپنے بازوؤں میں سیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ کامنی
 نے اپنے آپ کو اُس کی مٹنی پر چھوٹتے ہوئے کہا: مجھے روٹی تو پکانے دیکھئے،
 ۲۔ نہیں جان سے پالی کو! روٹیاں پھر کپا لینا یہ کہہ کر اُس نے اٹھ مار کر تو

پہلے سے گرا دیا۔

وہ خوش تھا اور سرتاپا نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب وہ بیٹک میں دڑی پر بیٹا ہوا تھا۔ ہانگیں اسٹاکر قریب پہنچیں ہوئی کرسی پر پاؤں کا رکھے تھے۔ ادب بکلی کی جگہ لگاتی ہوئی روشنی میں دیکھ لی کا پرچہ پیٹ پر دوسرے اس کی دقت گردانی کر رہا تھا۔
کیس مرتبہ پیر کا منی پہرے کے آگے بیٹھ اس کے لیے پڑھے پکار ہی تھی۔
اس وقت سے پہلے زندگی کے جو دن گزر چکے تھے، وہ بالکل بے کیف نظر آنے لگے۔ یہ مسرت یہ لذت اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی، دل مطمئن تھا، جسم ہلکا پھلکا اور صحت محسوس ہوتا تھا۔ دوسرے پرنما بل بیان کیفیت طاری تھا، آن کا منی اور وہ ایک ہو گئے تھے۔

کھانا تیار ہو گیا تو انھوں نے ایک ساتھ لی کر کھایا۔ ایک دوسرے کے منہ سے منہ مار کر نالے چھینتے رہے۔ جیسی مذاق اور چہل میں وقت گزر گیا، اور آخر وہ دائرے پر دھک سنائی دی۔

کامی نے دروازہ کھولا۔ بیچنا تھا کام معصوم چہرہ دیکھ کر کہیں کے دل میں فخر پیدا ہو گیا، لیکن کامی آٹے آئی، آپ کے دوست تو اٹھ اٹھ کر بھاگ رہے تھے، بڑی مشکل سے بٹھائے رکھا میں نے،

بیچنا تھا نے بے شکناز اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا، یار کمال کتے ہو،
آخر گھبرانے کی کیا بات تھی؛ دوست کی سادگی اور اخلاص دیکھ کر کبھی کو شرم ہی محسوس ہونے لگی اور وہ کچھ نہیں کہہ سکا۔

کہو کھانا کھا دیا؟

آؤ تو پلو حیدر علی کے اس :-

لاستے میں بیچ ناتھ دھوت کی باتیں کرتا رہا کہنے لگا : ڈاکٹر مٹرا میرے بہت گہرے دوستوں میں سے ہیں ، بٹے پریم سے کھانا کھلایا ، واپس نہیں آنے دیتے تھے ، ہزار جیلوں جان چھڑا کر آیا ہوں :-

جب وہ جیلانی کے ہاں پہنچے تو معلوم ہو کہ وہاں کوئی فوجی رشتے دار باہر سے آئے ہوئے ہیں اس لیے وہ برج نکھیل سکیں گے : ان کا پروردگار ہم پریم ہو گیا ریفر دہ کچھ چرتک اور صحرانہ جلتے سے پھر بیچ ناتھ نے کہا : آؤ گھر بیٹھیں سردی بہت زیادہ ہے :-

بھئی اب اہانت دور اب میں گھر واپس جاتا ہوں ، پھر ملاقات ہوگی چنانچہ مصافحہ کر کے دو ایک دفعہ سے رخصت ہو گئے ،

آج کے مسرت انجیز ناتھ سے اس کا دل اگرچہ سرد تھا لیکن دوست سے اس پاجی پن کے باعث خیر طامت بھی کرتا تھا اور جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اپنی ٹیک اور مصمم بیوی کے تصور سے اس کا دل اور بوجھل ہو گیا ، بیماری سردی میں ٹھنڈی ہوئی آگ کے قریب بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی

جب وہ جایا کی دکان کے قریب پہنچا تو حسب معمول اس سے پوچھا : کیوں بے جیہ کوئی آیا تو نہیں تھا جس میں ملنے کے لیے ؟

جیانیہ سر اوپر اٹھایا ، ابا ابو بیچ ناتھ آئے تھے ، یہ سے سمیتر چلے گئے ، مجھ سے تو کچھ پوچھے نہیں ، جب آپ نہیں آئے تو پہلے سے انتظار کر کے چلے گئے :-

بیچنا تھا؟ اُس کے سلی سے بلی سی جیج بھل گئی اور وہ خشک کر کھڑا ہو گیا۔

ابن جی بیچنا تھا باؤں

دکان سے مکان تک چند قدم کا ناملا اُس نے بہت آہستہ آہستہ طے کیا جب وہ بیڑھیوں پر قدم رکھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ کھڑی ہوئی دونائیں پھرانی جگہ سے بٹ گئی ہیں، اس نے احتیاط سے انہیں ٹکا کر رکھ دیا اور پھر ایک لمحہ بھر کے سکوت کے بعد اس کے منہ سے مدھم سی نہیں بھل گئی اور جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہاں ہر چہرہ پانی پر چھانی تھی، ماحول پر سکون اور آرام وہ محسوس ہو رہا تھا، اس کی بیوی اندر والے دروازے میں کھڑی دکھائی دی، وہ اس وقت ترنگنہ پھول کے ماحند تر و تازہ اور اہل دکھائی دے رہی تھی، وہ پھول جس کا مہرہ شبنم سے بڑی احتیاط سے دھو ڈالا ہو، جس پر بھی ہوئی گود کی ماسٹوم تہہ کسی سے چم چوم لی ہو۔

وہ بڑے موقع پر میٹھ گیا، شائقا شائع گل طرح چمکتی ہوئی نزدیک آئی اور اس کے قریب کونچ میں دھنسی گئی، اس نے سر سے پاؤں تک بیوی کا ہانڑہ لیا اور مسکرا کر بولا، شنو! آج تو تم بہت خوش دکھائی دیتی ہو۔
اپنے منہ سے انڈاز میں باروں پر اتھو پھیرتے ہوئے وہ لجا کر مسکرا دی اس کے تر و تازہ ہونٹوں سے سپید سپید مات کسی حد تک نمایاں ہوئے اور اس نے بلا کچھ کہے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے کندھے پر رخسار ٹکا دیا۔
شنو کی نیند کی ماتی پلکیں بو جھل ہو کر ٹپکنے لگیں، وہ چند لمحوں تک شنو کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا، پھر اس کی پیٹھ پر کبھی سی ٹپکی دے کر بولا، میں بھی بہت خوش

ہوں شنفہ ! قدا ابرلا و تو عید اللہ گریٹوں کا ڈیرہ

کر نسل سنگھ

دیکھ جاٹ کی دوہیزوں میں جان بھرتی ہے۔ اس کی لامٹی اور اس کی گھوڑی (یا گھوڑا) اگرچہ چیزیں چوری ہو جائیں تو انہیں تلاش کرنے میں وہ زمین آسمان ایک کر دیتا ہے اگر کوئی ہاٹ سے اس کی یہ چیزیں چھین لینے کی کوشش کرے تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اگر دشمن مہاری پرشے اور اس کی یہ چیزیں چھین جائیں تو وہ چلو بھڑائی میں شوق مہرتا ہے۔

کر نسل سنگھ کے ساتھ دوسری قسم کا مادہ پیش آیا تھا اس کی خوبصورت یترغرام گھوڑی چوری ہو گئی تھی۔

وہ لمبا چوڑا بدعوب خنصرہ در زمیندار تھا کسی کی کیا خیال کہ اس سے مقابلہ کر کے گھوڑی چھین لے جاتا گھوڑی کے چوری چپے جاتے پر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، لیکن لاچار تھا۔

چار پانچ دن گزر گئے۔ اُس نے مجھے اس مادے کے بارے میں کچھ نہیں کہا، لیکن میں جانتا تھا کہ ایک دن وہ مجھے مزدور راستے لے گا۔ اگرچہ میں اس کا ذکر تھا اور وہ مجھ سے بڑی بڑی طرح پیش آتا تھا پھر بھی اہم معاملوں میں وہ اکثر میری صلاح لیتا تھا۔

دنی بات جیٹی صبح کا وقت تھا، میں گاؤں سے آدھ کوس دور طویلے

کے قریب لگے ہوئے کونوئیں سرسوں پل راتھا کہ پتھا کھاتا ہوا میرے پاس آ کر بولا : قبیحہ ، تجھے سردار بلانا ہے نہ

میں اصل معاملہ سمجھ گیا۔ میں ابھی تک سوچ نہیں پایا تھا کہ اگر وہ گویا کے باری میں پورے تو میرا مشورہ کیا ہونا چاہیے ؛ یوں ہی میں اس کے سامنے جانے سے کتراتا تھا ، کیونکہ وہ ناگالی گلوچ کے بات نہیں کرتا تھا کبھی غصے بہت تاؤ میں آتا تو خون کے گھونٹ چھینے بغیر اور کوئی پارہ کا نہ نظر آتا ، اس کا مقابلہ کرنا بے کار تھا ، آخر شیر اور بکری کا مقابلہ بھی کیا ؛ اگر کوئی پھوڑ دیتا تو میرا لائل پور یا اس کے گرد و نواح میں ممکنہ ممکن ہوتا ، اور اگر اپنے گھاؤں ضلع ، اور حیدر آباد میں بالوں تو روزی کا سوال مل نہیں ہو سکتا تھا ،

پھتے کی بات سن کر بھی اٹھنے کو ہی نہیں پایا ، کیونکہ اس وقت صبح کی دہری دھوپ میں دل کو بڑا آندھ محسوس ہوتا تھا ، لیکن اٹھنا ہی پڑا ، سردی کے منہ کون آئے ؛

میں نے پھتے سے کہہ دیا کہ وہ میری جگہ بیٹھ کر ذرا بیل کو ہکتا ہے مگر پتہ بولا کہ وہ اس وقت کھیتوں کو جاتا ہے ، میں نے تھوڑے کر کے بھڑکی دیر تو بیٹھو میں طیلے سے لڑکے کو بھیج دوں گا ، پھر چلے جانا : وہ بیٹھ گیا اور بچہ لڑکی اتار کر سر کے پھول پر ہاتھ پھیرنے لگا اور پھر گڑی جھاڑ کر اسے لڑکے کو سر پر لپٹنے لگا ،

جب کہیں طویلے کے لمبے چوڑے من میں داخل ہوا تو دیکھا کہ کرنل سنگھ بڑے چمڑے کی مروت کو ڈار رہا ہے ، دوسرے دن گھر کی عورتیں سیلے کو جانے

والی تھیں۔ اس کے سلسلے میں یہ تیاری ہو رہی تھی۔ مستری بسولے کی الٹ طرف سے پیسے کی ٹھکانی کر رہا تھا، اور سردار اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا۔
 "میں نے قریب پہنچ کر دوڑوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔" ست سری اکال سردار جی۔"
 اس نے تجھے کچھ جواب نہ دیا، اور نہ میری طرف دیکھا ہی، بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے میری موجودگی کا احساس تک نہ ہو۔

کافی دیر تک میں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھے کھڑا رہا اور سردار کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ دھم دھم برس سے اوپر ہو چکا تھا، کچھ بال فروز پک گئے تھے۔ لیکن اس کے جسم میں قدرے بھر کمزوری دکھائی نہیں دیتی تھی، چوڑے نشتوں والی مردانہ ناک، ہونٹ بھر پور، داڑھی اور سر کے بال گھنے، رنگ تپے ہوئے تانبے کے باندھے، میں اس کے بڑے بڑے ہاتھوں اور چوڑی کلائیوں کو دیکھتے ہوئے دل میں سوچنے لگا کہ کاش میں اس سے بھی ڈگنے ڈیل ڈول کا مالک ہوتا تو اسے گیند کی طرح اچال کر پرے پھینک دیتا۔ وہ سنبھلتے ہی نہ پاتا کہ میں اپنا بھاری بھر کم بازو اٹھا کر وہ ہاتھ دیتا کہ گردن مڑ جاتی، پگڑی پرے جاگرتی اور اس کا سر کپڑے میں دھس جاتا، اگلے چاموں دانت ٹوٹ جاتے اور نشتوں سے خون بہنے لگتا، میں نے یہیں تک نقشہ کشینا تھا کہ سردار اپنے منگے ناچنے سے بھاری آواز نکال کر بولا،
 "اوتے بھوتیار۔"

"جی سردار جی! —" میں نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

وہ مجھے ہمیشہ اسی نام سے پکارتا۔ میرے سر کے بال جوڑے کے قابو میں نہیں آتے اور داڑھی اور مونچھوں کے بال بھی اڑے اڑے سے رہتے

تھے۔ میری اس حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے ایک نوذکرہ لکھی
تیرا نام تو بھوت سنگھ ہونا چاہیے۔

اب آپ ہی سوچئے، بھوت سنگھ اور بھوتیا میں کتنا بڑا فرق ہے !
” بھوتیا ! گھوڑی کا پتہ نہیں چلا ؟ “

مجھے کوئی مناسب جواب نہیں سوچ رہا تھا۔ اب تک میرے ذہن میں کوئی
ترکیب نہیں آئی تھی۔

مجھے چپ دیکھ کر سردار بولا ” اوتے بولنا کیوں نہیں بھوتیا ! “
اب بھوتیا سے بھوتنلا بنا دیا گیا۔

میں نے ہر ڈاکر سوال کیا ” آپ نے تھانے میں رہٹ نہیں سکھائی ! “
” بھوتنی دا “ وہ میری طرف دیکھے بغیر ہنسا ” پلس کیا کرے گی ۔ اگر
میں کسی کی گھوڑی لا کر اپنے طوطے میں باندھ لوں تو بتا پلس کیا کرے گی۔
..... اور پھر پلس کو کھجور کرنا کیا مردوں کا کام ہے ہیں ؟ “

بھوتیا بھوتنیا اور بھوتنی دا! ————— پہنچے پچ گالی دیئے میں سردار کو یہ
طولے حاصل تھا۔

جیسے کہ میں نے اوپر لکھا ہے، سردار اکثر معاملوں میں مجھ سے صلاح
مشورہ کرتا تھا۔ لیکن مجھے ایسا ٹیڑھا مسئلہ پہلے کبھی مل نہیں کرنا پڑا تھا۔ لائپٹ
کے علاقے میں ان دنوں چور ڈاکوؤں کی کمی نہیں تھی، اس زمانے میں مسلمان
خانہ بدوش بھی پائے جاتے تھے جنکے مرد بڑے وجیم اور عورتیں بڑی حسین
ہوتی تھیں، ان کا داؤ لگے تو ہاتھ مار جاتے تھے، اور پھر بارہا علاقہ بھی قریب

سودا ہو سکتا ہے۔ ایسے آدمی کو جو گوڑی لے جائے پانچ سو روپیہ انعام دینے کو
تیار ہوں اور اگر حرام زاد سے چور کا پتہ مل سکے تو پانچ سو روپیہ انعام دے سکتا ہوں۔
میں ایک بار چور میرے چگل میں آجائے تو سولے کی گردن مروڑ دوں تاکہ آگے کو
سب کو کان جو باتیں... سمجھے؟

اب کے میں نے بڑی ششکل سے جواب دیا جی سہا۔
”میں جانتا تھا کہ اب کسے بھی میں نے خامرہ لادیا تو گھاریوں کی بو چارہ سینہ
پڑے گی۔

مرد نے آخری بار اپنی آنکھیں کو میری گردن پر اور کن کر کہا: بھوتیا! یہ کام
جیسے بھی ہو کرنا ہو گا۔

دوسرے دن گھر کی عورتیں اور کچھ بڑائی کی عورتیں ان کو یہاں سے پکڑ کر
پر لہ گئے اور تین ایک گھوڑی پر سو بھونگی اس شان سے اٹھانے پہلے کو روانہ
ہوا۔

آٹھ چناب کے میلے میں کیسے بے ہوش ہوئے ہیں، بھنگ میں مگلاں، سہل بندھو
جائے۔ دُور دُور کی غمے اور مقامات تک جاتی یہ مرد آکھڑیوں پر خوب چڑھاؤ
ہر تہہ پہنچاؤ، گناہیں، بولی ٹول، غریبہ، ہر قسم کی رونق، نفرت، گت، بے رات
کے بے سیکڑوں گھس، روستی میں دکھائیں اپنی بد آگاہی، وفات میں ان دکھائیں
میں دیر باجوہ کے ذوق اور مزدور کی اشیاء رکھتی ہیں

یہ میدان کھنڈی ذکر کر دیا ہوں متواتر چھ سات دن تک گتے یہ ہلہ بولگام
میں چار چھ دن تک رہے کا تھا اس لیے جم اپنا نہ تھا، مال لگی اور ایدمن وغیرہ

سب کچھ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ بڑی سردار کے گھرانے کے کئی لوگ مرنے لگے تھے اس لیے ہمارے نیچے ملی خامی چہل پہل دیتی تھی، سب سے زیادہ رونق سردار کی سب سے بڑی لڑکی ال کوہ کی وجہ سے تھی اسے سب اکثر لالہ کے نام سے پکارتے تھے، اپنی جوانی اور حسن کے باعث وہ اپنے باپ سے کم شہرت نہیں رکھتی تھی۔

میلہ کی تھاجگل میں ایک بھڑاسا گھوڑا گیا تھا، پنگوڑے، مٹی کے برتن۔۔۔ مسائے دار پاٹ اور ٹھانڈیوں کی رکائیں تو تمام قدم پر موجود تھیں رنگی کئی قسم کی دکانوں کے علاوہ تقریباً کے کئی مسلمان بھی موجود تھے، کہیں پر جے پور اور بھرت پور کی ٹھانڈیاں تھانڈیوں کے طبقے میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتی کہیں بریرا نیچے کا قصہ سوز بھری آواز میں سکایا جاتا، کہیں قوالیوں پر لوگ سر دھستے کہیں بولیاں بھولیاں۔

اب کے میلے میں جو نئی چیز دیکھنے میں آئی وہ تھا۔ بوتا، چلتا، پھرتا بالیسکوپ میں نے شہر کے کئی بالیسکوپ دیکھے تھے جن کے مقابلے میں یہ بالکل سچ تھا بھر بھی ان دیہاتیوں کے بے جنہیں شہر جانے کا موقع کم ہی ملتا تھا، یہ ایک حیرت انگیز چیز تھی تہوں بھرا آسمان اس بالیسکوپ کی چھت، چاروں طرف قلاتیں پردہ یوں دکانا دیتا تھا جیسے کئی دست و پال کو سی کر بنایا گیا ہو، ایک جھوٹری میں مشین رکھی تھی، باہر ٹکٹ نہیں دیتے تھے فقط چار آنے نقد دینے پر آری کو زمین پر بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی اور ساتھ آنے والے کو آوی بغیر بازو کے لوچے کی کرسی پر بیٹھ سکتا تھا، کھیل شروع ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا، جب کافی لوگ جمع ہو جاتے تو کہیں شروع کر دیا جاتا، مشین ایک نئی اس لیے ہر دس بارہ منٹ کے بعد۔

کچھ منٹ کا وقفہ ہوتا،

ایک شام گھر کے سب لوگوں نے ہائیکوپ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔
چنانچہ رات کے کھانے سے فرصت پا کر ہم لوگ روانہ ہو گئے، ہم سب آٹو آٹھ آنے
کی کرسیوں پر با بیٹھے،

کافی دیر انتظار کے بعد کھیل شروع ہوا، دو درمیں ہو چکیں تو میں نے دیکھا کہ
تین چار جوان بڑے دھڑلے سے اندر داخل ہوئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے، یہ
مسلم ہونے پر کہ دو درمیں چل چکی ہیں انہوں نے گلا بھاڑ بھاڑ کر آوازے کسے
شروع کیے، ایک آیا تو اس سے کھیل پھر سے شروع کرنے کے لیے کہا، چنانچہ کھیل
از سر نو شروع کر دیا گیا، باتی لوگ بھی خوش تھے کہ ان کے دام پھر سے وصول
ہو رہے ہیں۔

یہ ماجرا دیکھ کر میں ذرا چونکا ہو گیا، کچھ تو فرار دھڑ بیٹھے تھے، اور کچھ تاریکی
کی وجہ سے میں ان کی صورتیں اچھی طرح دیکھ نہیں سکا لیکن ایک بات صاف میل
تھی کہ وہ دھاک دھاک لگتے کیونکہ ہمارے خیرے کے کپنے پر کھیل پھر سے شروع
نہیں کیا جاتا تھا۔

میں پچھلے تین روز سے اپنے ملک کے کپنے کے مطابق ایسے آدمیوں کی جستجو کرتا
رہا جو ایسے کام آسکے لیکن ابھی تک مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی، چنانچہ
اب میں نے طے کیا کہ ان جوانوں کا پیچھا مزدور کر دوں گا، کھن جے ان میں سے کام کا
آدمی مل جائے۔

شوخم ہونے کے بعد باہر میں نے گیس کی تیز روشنی میں دیکھا تب مجھے یقین

جنا کہ وہ اصل حرام ٹھکانہ جو ان ہیں۔ یوں تو وہ سب کے سب نوجوان لہجے تڑنگے
 مضبوط اور اکھڑتے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک تمام طور پر میری نظر میں چمک گیا وہ
 اپنے ساتھیوں میں نہ صرف سب سے طاقتور اور وجہ نظر آتا تھا بلکہ بات چیت
 کرنے کے ذہننگ سے بھی ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔ میں موندہ پا کر باتوں ہی
 باتوں میں اسے ٹھون پاتا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد ان کا گروہ ایک دکان پر ٹک گیا۔ اس وقت ایک
 بیک اس نوجوان نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دوڑے سے پرہیز کی ادھ سے ایک
 عورت کی جھلک دکھائی دی اور وہ اپنے ساتھیوں سے رخصت ہو کر ادھر کو چل دیا۔
 میں بھی کچھ فاصلہ دے کر پیچھے پیچھے چل دیا۔

وہ دونوں کمیتوں میں بنے ہوئے ایک گروہ کے ریسٹ کے قریب پہنچ کر
 گئے۔ میں پردوں کی اوٹ میں لمبا پارک کالے کر ان کے قریب پہنچا کہ ان کی باتیں سن
 سکوں۔ لیکن وہ اتنی دھیمی آواز میں بول رہے تھے کہ کچھ سمجھنا ممکن تھا۔

میں دھندلی روشنی میں آنکھیں مپاڑ مپاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ عورت پارک کی میری
 طرف بیٹھ کے کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس نے منہ پھیرا تو میرے حلق سے جھج
 بھجھتے نکلتے رہ گئی۔ وہ لال تھی۔

بجیب بات تھی، اخوان کی محبت کب شروع ہوئی تھی؟ یزید دنیا یا پریم تھا۔
 کیونکہ اگر پرانی کچڑی کب رہی ہوتی تو اب تک یہ بات مشہور ہو گئی ہوتی۔ کیونکہ
 اگر اس نوجوان کی ریاست گاؤں میں آمد و رفت ہوتی تو مجھے مزید پتہ چل جاتا۔ بلکہ
 بھی اسے جانتے گئے۔

کچھ دیر تک ان میں گٹ گٹ کر باتیں جوتی رہیں۔ پھر بھ لال بات لگی نوجوان
نے بڑھ کر اس کا بوسہ لیا۔ اس پر وہ ایک لذت لاکھتھ بھرا کر پٹ بھا
گئی اور دھڑ سے مسکرا کر اسے انگوٹھا دکھاتے لگی۔

نوجوان بھی مسکراتا ہوا دوسری جانب چل نکلا۔ وہیں پستوس کے پیچھے ہو

لیا۔

چلتے چلتے میلے میں داخل جوتے سے پہلے وہ ایک دم سکا اور گھوم کر میری طرف
دیکھنے لگا۔

میرے لیے بھاگ بھگا یا پھپھانا ناگھن ہوا۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ
اس کی طرف دھیان دے دے بغیر پاس سے گزرتا ہوں گا جب اس کے سامنے پہنچا
تو اس نے اپنی بیٹی لاشی آگے بڑھا کر میرا ہاتھ روک دیا۔

میں نے ہلکی ہوئی آنکھیں دھیرے دھیرے اوپر اٹھائیں کچھ دیر تک
سکوت طاری رہا۔ پھر وہ بولا کہ کبھی آتا رہا ہے پیچھے ہٹو دھڑکے کیوں پڑے
ہو؟ جاؤ یا نہ کام کدنا یا اگر اپنی زندگی سے ہی تنگ آچکے ہو تو تباؤ دوں ایک
لحظہ؟

میں نے بات بنا کر جواب دیا۔ دیکھو سرور دل بہاؤ۔ بھلا مجھے تباہ کیا پھا کرنے کا کیا
عزت ہو سکتی ہے؟ لیکن میں عرض اس لڑکی کی وجہ سے تباہ رہے پیچھے لگا رہا۔
اس کے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ اس لڑکی سے تباہ کیا مطلب یہ ہے؟
کیا تم جانتے ہو کہ کس کی بیٹی ہے؟

بہنیں :-

” واہ جس کے ساتھ پیرم کے بھولے بھولتے ہو اس کے بارے میں آتا بھی نہیں جانتے ۔“

• دو تین دن کی علامات ہے ابھی اس قسم کا کوئی بات ہی نہیں ہوئی لیکن تم کون ہو؟

وہ سردار کرنل گنگو کی بیٹی ہے اور میں ان کا پرانا نوکر ہوں ۔“

یہ سن کر وہ لمحہ بھر کو چپ رہا، پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگا: ” اچھا تو یہ بات ہے، ہاں کرنل گنگو کا نام تو میں نے بھی سنا ہے ۔“

” ضرور سنا ہو گا، ملاتے بھر میں ان کی دھاک نے اس تے تھی ہوئی مرنچوں کو اٹھی سے چھوٹے ہوئے کہا: ” مجھے! تم تو بڑے کام کے بھلے آؤ، خداؤ ٹھنیوں کا دودھ پلاؤں تمہیں، ورنہ یہ بدل کھول کہا میں ہوں گی ۔“

ہم دونوں ساتھ ساتھ چل دیے، بہادر راستہ شریہ کے تھا اور درختوں میں سے ہو کر ہلتا تھا، میں ایسے بے چوٹے اکڑ آدمی کے ساتھ قسم بے قسم پٹے ہوئے ڈرغموں کر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک اچھڑے اور میں یہیں پڑ کے تنے کے قریب رُجیر ہو جاؤں گی مگر وہ ایسا کمینہ نظر نہیں آتا تھا، وہ چاہتا تو مجھے دن دھاڑے ٹسکانے لگا سکتا تھا ۔

سبلے کے کپ سرے پر میروں کے نیچے کچھ اڑتیاں بلبل رہی تھیں، اور مردِ خنر کچھ چارپائیاں بھی تھیں، ہم ایک چارپائی پر بیٹھ گئے، دودھ پک کر اس نے مرنچیں، ہوتے ہوئے کہا: ” ابھی یہی بات ہے کہ لاک نے تو مجھ پر جانور کر دیا ہے ۔“

میں نے بہت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا: ” پر میں مات کہہ دوں کہ تم

اگ سے کھیل رہے ہونے

وہ بے پرقالی سے ہونٹا زہ نگاہ گنگ کی دھکیاں مت دو، سیدھی بات ہے
ہے کہ اس لڑکیا کو اپنی جھوٹا بنانے کا اندھ ہے میل۔۔۔ اب چاہے سیدھی انگلیوں سے
گھس بھگے ڈائٹرز سے ۔

نہیں نے ایک بار پھر اس کو سڑ سے پاؤں تک دیکھا اس میں گھجھو جوانوں والی ہی
خوبیاں موجود تھیں، میں نے دیر سے سے کہا دیکھو سڑ پر ایمر تو پس اتنا جانتے
ہیں کہ کام ہوں کہنے کے ساتھ رہائے اور لائٹ بھی نہ ٹوٹے تو
۔ پلیروں ہی ہیں ۔۔۔ نہ وہ سکرا دیا ۔

میں کچھ دینک پپ چاپ سوچتا رہا، پھر پتلا بل کر بولا: اگر تم بارے سڑ پر
ہی کا ایک کام کرو دو کام اور گھسیلوں کے دام دلی بات ہو جائے،
”وہ کیسے؟“

بات ہے کہ بارے سڑ پر ہی کی گھوڑی چھدی ہو گئی ہے اس کا اب
نہیں کہنی سراج نہیں ملا، اگر کہیں تم اسے ڈھونڈ نکالو تو رہا تھوڑا پیہ نقد انعام
پاؤ اور اگر چھد کر بھی پکڑو تو رہا تھوڑا پیہ اندھ ملے گا۔ اس کے علاوہ مجھے یقین
ہے کہ وہ اتنے خوش نہیں گئے کہ انہیں تم جیسے حسین جوان سے لاکھ کا رشہ
کرنے سے بھی انکار نہ ہو گا۔

”یہ بات ہے۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ سوئی میں ڈوب گیا، پھر بولا
”یہ سبے ڈائٹرز ہی کھیر۔۔۔۔۔“

”ڈائٹرز ہی کو سیدھی کرنا تھوڑا سے بائیں اتھ کا کھیل جو اچھا ہے تو“

یہ تو ٹیکہ ہے لیکن ۔۔۔

• لیکن کیا میں تمہیں گھوڑی کا طیبہ بتائے دیتا ہوں ۔۔۔ آخر تم کہیں چکر
میں پڑے ہو، کام مشکل ہے تو انعام بھی تو بڑا ہے۔ اگر تمہیں روپے کی فوجا جڑیں
تو لالہ کی پرواہ تو ہے :-

وہ میری طرف دیکھ کر ہنسا۔ بات ہے کہ مجھے اور سب کام چھوڑ کر یہ کام کرنا ہو
گیا۔۔۔ اچھا طیبہ بتاؤ گھوڑی کا :-

اس پر میں نے گھوڑی کا طیبہ بتایا اور مک مک کا پہلا پتہ بتا دیا۔ سب کچھ سن
کر وہ بولا دیاریوں گنا ہے کہ یہ گھوڑی میں نے کہیں رکھی ہے ۔۔۔ پھر وہ انگلیوں
سے ماتھے کو دبائے لگا، پھر دفعتاً بولا :- اچھا استاد ہاتھ ملاؤ ۔۔۔ مجھے اُمید
ہے کہ کام بن جائے گا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا کیوں کچھ یاد آیا :-

ہاں ۔۔۔ آیا تو :-

• تو پھر کب تک امید رکھیں جائے :-

• دیکھو استاد ملتے میں ایک سے ایک دھا کر پڑھے ہیں، پریم شیر کی
مو پختہ کے بال اکھاڑنے والے آدمی ہیں ۔۔۔ بس اب تمہیہ کر لیا ہے کہ یہ کام
کس کے ذمے کر مائل کروں گا۔ لیکن یاد رکھو اگر لالہ کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تو
نتیجہ ہی غیر نہیں :-

ہاں ان سب ملک لیکن میں انک سے کیا تاؤں کرتا مکتے دن کے اندر
یہ کام کر سکے گا :-

اس نے پھر کچھ دیر غور کیا اور پھر بولا: اچھا صرف دس دن کی یہ مدت رہے گی۔۔۔۔۔

یسے ہو جیسے پر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد ہم رخصت ہوئے۔ میں بے حد خوش تھا۔

میلے سے واپس آ کر میں نے سردار کو بتایا کہ گھوڑی کا پتہ لگانے کے لیے ایک بڑے دھاکڑ کو کمانٹھ آیا ہوں یہ سن کر سردار کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ اس جوان کی خوش دھوت اور ڈیل ڈول کے بارے میں سوالات پوچھنے لگا۔

میں نے اس کی خوب تعریف کی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کہیں آلی سے اس کا رشتہ ہو جائے تو جو بڑی خوب رہے۔ لیکن میں نے ان کے مشت کاراز نہیں کھولا۔۔۔۔۔

یہ سن کر سردار نے گھوڑ کر مجھے دیکھا اور گالی دیتے دیتے رک گیا۔۔۔۔۔ ظاہر تھا کہ وہ نیم رخا مند ہی تھا۔ نہ اس کے منہ میں گھام کون ڈال سکتا تھا۔ وہ گورتے گئے۔ ایک دو تین۔ سیانہ تک کہ نو دن گزر گئے اور صبح دن آن پہنچا۔ اس وقت تک ہم تاحے نا امید ہو چکے تھے، سردار نے جس کے دت ہی مجھے دو چار گالیاں سنائیں کہیں زیادہ کلاری گالیاں رات تک کے یہ منوط رکھیں۔۔۔۔۔

میرے دل میں اب بھی امید کہ کبھی سی کن باقی تھی، آخر کام بھی تو جان جو کھو کا تھا۔ نہ جلتے بے چارے کو کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔۔۔۔۔ لیکن مجھے وہ آخری ارادے والا جہان معلوم ہوا تھا، یہ ناممکن تھا کہ وہ تہیہ کہے اور پھر نام کام

سردار اس پر دو کو دیکھتے اور گھوڑی واپس پاتے کے لیے بے قرار تھا۔
ن خیال سے کہ شاید چھ کا بھی سراغ مل جائے کچھ کھڑ بانوں کا انتظام بھی کر رکھا
تھا کہ موقع پر کام آئیں۔

وقت گزرتا گیا، دھوپ ڈھلنے لگی لیکن اس جوان کا کہیں پتہ نہ تھا، اب
یہ سہ ماہی کلاماں پہنچ پھ بگڑنے لگا، اور میں اس ڈسے کہ کہیں اس کے قبر کی
نویں نہ آ جاؤں طیلے کے باہر ریٹ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، میں قدر دور
نہن خروں کو دوڑاتا تھا، ہر لاگیر پر اسی کا دھوکہ ہوتا۔

اسی اٹھائیں طیلے سے سردار کی آواز آئی۔ اُسے بھوٹا؟

آواز کے اندر سے ظاہر تھا کہ اب میری غیر سنیں لیکن اندھانے کے سوا چارہ کد
نہیں تھا، جاتے جاتے میں ٹھٹکا، قدر بہت قدر سے ایک سوار دکھائی دیا یوں
نہ اس قسم کے کئی سوار آتے جاتے دکھائی دیتے ہی ریتے تھے اور پھر اس قدر
دور سے یوں بھی اُسے پہچانا شکل تھا لیکن اس سوار کے ہاتھ میں ایک اور
گھوڑے کی گام تھی جسے وہ تیزی سے بگڑا لیے جا رہا تھا چند لمحوں کے بعد
میں نے اپنی گھوڑی کو کچھ کچھ پہچان لیا اور پھر رچے یقین ہو گیا کہ وہ سوار بھی وہی
نہ جوان تھا۔

اس پر نہیں دیں سے چلا اٹھا سردار بھی گھوڑی مل گئی۔

سردار باہر نکل آیا، اس وقت تک نہ جوان اور قریب آچکا تھا، ہم سے
آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ سردار گھوڑی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور

اس نے بڑی گرجی شے سے اس سوار سے ہاتھ ملایا اور اپنی گھوڑی کو بچھپاتا ہوا
 طویلے کے اندر سے گیار

گھوڑی مہن میں ہاتھ کر سوار نوجوان کا ہاتھ تھامے اس کو دو کمروں میں
 سے بڑے دالے میں لے گیا، اس کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا
 رہتا تھا۔ اور پھونٹا کمرہ صرف موسم سرما میں مویشیوں کے ہاتھنے کے کام آتا
 تھا، بڑے کمرے میں ویسے کچھ کرسیاں اور ایک بڑی سی میز چڑھی تھی، یہ سزا
 کی امدت کی نشان دہی تھیں، اکثر مہازوں کی مہمانداری یہیں پر ہوتی تھی،

اس وقت نور الدین جوان کی شکل وصورت قابلِ رشک تھی، وہ ایک لمبا سبک
 لاکر تاپتے تھا، اس پر متعدد سوپ کے بٹنوں والی واسکٹ نیچے منگیا رنگ کا
 تہبند، پاؤں میں تیل سے چمڑے ہوئے بھاری بھرکم ویس جوتے، سر پر کف
 لگی، طرہ در پگڑی جس کی وجہ سے وہ لمبا جوان اور بھی لمبا دکھائی دیتا تھا،
 سردار اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور پانسو روپے کے نوٹوں کی
 گڈی میز پر رکھ کر کہا: "نوجوان یہ پانسو روپیہ ہے۔۔۔ ہاں بھوتیا، ذرا
 اسی شربت کا انتظام کر دو۔"

نوجوان نے کہا: "دیکھئے اسی شربت کی تکلیف نہ کیجئے کیونکہ مجھے فردا
 واپس جانا ہے۔۔۔" البتہ مجھے آپ سے پانسو روپیہ اور بھی لینا ہے۔"

سردار بولا: "وہ تو چور کو میرے سامنے لے آتے یا مجھے اس کے پاس
 لے جاتا تو۔۔۔"

• میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

سے کھڑا ہو گیا، مونچوں کو انگلیوں سے چھو کر مبر لوہا آواز میں بولا: آپ کی گھڑی کا چور آپ کے سامنے کھڑا ہے۔

اس کی یہ بات بچے یوں لگی جیسے بم کا گولہ پھٹ گیا ہو۔۔۔ مجھے تعجب ہوا۔ کیا واقعی؟ لیکن پچ پچ ہلے سردار کی گھڑی چرانا معلوم آدمی کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ دوسرے ہی لمحہ میں مجھے خوشی کا احساس ہوا دیکھنا تھا کہ آپ سردار کیا کرتا ہے۔ کیونکہ آستے برسوں میں میں نے کسی کو اس قدر حرارت کے ساتھ دھکارتے نہیں دیکھا تھا۔

اور سردار بہت بنا کھڑا تھا، یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اس کے سامنے پنا کا لہر اس کی آنکھوں میں دمک رہا ہو، مگر اس کے ہونٹ لڑتے دے تھے، لیکن بات منہ سے نہیں نکلتی تھی۔

غیر سردار دوسرے آدمیوں کو ہاتھ کے لیے دروازے کی طرف بڑھا اور مردہ نوجوان بڑی دھیمی سے پانی کے گھڑے کی طرف بڑھا، قریب پرشے ہوئے کانسی کے کٹورے کو اٹھا کر اس میں پانی بھرا ادا ملیناں سے گھونٹ اور گھونٹ پینے لگا۔

سردار دروازے کے قریب کھڑا اس کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔۔۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔۔۔ نوجوان نے پانی پل کر انگوچھے سے مونچیں پونچھیں اور پھوی دالی لائٹی کو ہاتھ میں تول کر دروازے کی جانب بڑھا، جب سردار کھڑا تھا۔ کیونکہ اس دروازے کے سوا باہر جانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ سردار کی مٹھیاں تہہ ہو چکر کھل رہی تھیں اور کھل کھل کر بند ہو رہی تھیں

نوجوان اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دھیرے دھیرے قدم بقدم اس کے پاس پہنچا، ششک کر دیا۔ کالجہ بھر کو دونوں کی آنکھیں ملیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب وار ہوا کہ ہوا۔ لیکن سردار نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔

نوجوان آگے بڑھا اور طیلے کے صحن میں سے ہو کر بڑے دروازے میں سے باہر نکل گیا، سردار قندے تال کے بعد اس کے پیچھے گیا اور طیلے کے صحن کے بڑے دروازے پر ہانک رہا گیا۔

ہمارے کھٹ باز سردار کے حکم کے منتظر تھے، وہ نوجوان لپا اٹھنا سے پلتا ہوا اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا اور سوار ہونے سے پہلے اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا، مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں پر میہم سی مسکراہٹ چھوٹی رہی ہو جیسے وہ مجھے میرا وعدہ یاد دلایا ہو۔ اس کے بعد وہ ایک ہی جھپٹ میں گھوڑے پر سوار ہو گیا۔۔۔۔۔

سردار نے لٹخے بازوں سے اب بھی کچھ نہیں کہا، بیان تک کہ گھوڑا سوار دم دم سوپ میں کیڑیوں میں سے جوتا جوتا بہت صفہ نکل گیا۔

میں سردار کے پیچھے کھڑا تھا جبکہ وہ ایک کندھا بڑے دروازے کی چوکت سے ٹیکے پت پاپ کھڑا تھا، مجھے اس کا پیرہ نظر نہیں آ رہا تھا، اس لیے جانا حال تھا کہ اس کے چہرے کے جذبات کیا ہیں،۔۔۔۔۔

تھوڑی دیر بعد اس نے میری جانب دیکھی بغیر بے کیف اور بھاری لہجہ میں سوال کیا: تم اسی نوجوان کا رشتہ لاکھی کے ساتھ کہنے کو کہہ دے تھے؟ میرے ہونٹ، زبان اور حلق چشم زدن میں خشک ہو گئے اور میں

ڈک کے ارے کچھ جواب نہیں دے سکا۔۔۔ اس پر سردار نے گھوم کر میری
طرف دیکھا۔۔۔۔۔ اس کے موٹے ہونٹوں پر گھنی مومچوں کی ٹسٹری چھاؤں
تلی۔۔۔ ایک موبوم سی سکراسٹ جنم لے رہی تھی

خوشبودار موڑ

پیشہ کی طرح اس روز بھی دفتر کا کام ختم ہوتے ہی لطیف صاحب کے جسم کا جھڑبھڑکھنے لگا تھا۔ سائیکل کے ہڈیل گھومتے گھر پہنچے تو بالکل تھکا ہوا گئے شاید یہ مکان اتنی جسمانی نہیں تھی جتنی نفسیاتی۔ اسکو ڈھیر دے سکتے تھے لیکن سائیکل نے نباہ کئے ہار نہ دے تھے۔ اس خیال سے کہ جو رقم اس پر خرچ کریں گے دوپہر کے کام آجائے گی۔

انہوں نے گھر میں گھستے ہی سائیکل کو دیوار سے یوں دے مارا جیسے اب اس کوڑی کو کبھی موبہ نہ لگائیں گے۔ لیکن یہ تو ہر روز کا چلن تھا۔ دوسرے دن پھر اسی نچوڑ سے ملن ہو جاتا۔۔۔۔۔ ان کی دس حرکت سے یعنی سائیکل کو دیوار سے ٹکرانے سے گھر والوں کو ان کی آمد کی خبر ہو جاتی بچے بالفاظ خط، ہوشیار ہو جاتے، لڑکھائی دیکھنے پہنچاتی، مٹی بیگم کو صاحب کی تشریف آوری کی خبر سناتی، اوصاف مزاحمتی بھینے کے طرح کر س پرگنے سے پہلے دو نو گھنٹوں پر ہاتھ مار کر یا الشکنتے اور پھر ڈھیر ہو جاتے۔

ساتھ دیوار پر کسی زمانے میں ان کی داری امان نے ایک ڈاسا یا اللہ کا طفرہ چوکھنے میں بڑھا کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت انہیں داری کی حرکت عجیب

سی لگی تھی لیکن کیا معلوم تھا کہ ایک روز وہ بھی آئے گا جب بغیر اللہ کی
 امداد سے نہیں سکیں گے۔

نوکرانی ایک ہفتہ میں پہلی اند دوسرے میں نیم گرم پانی ساوٹا ہائی اینٹوں
 نے کرسی پر بسے ہفتہ دھوئے، مونہہ تزکیا، تولیہ جھٹ کر نوکرانی کے ہاتھ
 سے لیا، پھر بڑے پر قدر سعدونق آئی اتنے میں بیگم بڑے پیاسے اند میں
 دونوں ہاتھوں سے پائے اور ناشتہ کی ٹرے منہا لے کرے میں داخل ہوئیں
 وہ دل میں جانتے تھے کہ قربانی کا بجز ابوں شادی کی تربیگم نے بڑے بھوپن
 سے نصف دھن کے اس پاس بچے ان پر مانڈ کر دئے اور خود فرشتوں کی سی
 معصومیت طاری کر کے الگ ہو بیٹھیں۔۔۔۔۔ چنانچہ اب انہیں اپنے ہی قریب
 کے نقوش پر سجدے کرنے پڑے۔

بیگم کی رملنے میں سافونٹ میں تقسیم حاصل کرتی رہی تھی لیکن ایسی
 سنگم گرست بن گئی تھیں کہ میاں کے لیے باجرے کی میٹھیں چکیاں بکستیاں
 کرنے سے گریز کرتی تھیں، بھلا باجرے کی مکھی بھی کوئی کھانے کی چیز تھی لیکن
 میاں کے فاقہ پر تنقید کرنا مصلحت سے خالی تھا، لطیف صاحب نے بھی پہلے
 اپنا ہاتھ مکھی کی طرف بڑھایا، بیگم سے دو تین گھڑی گھر والے مسکرا بیٹوں اور
 بن بنان باتوں کا تبادلہ ہوا، پھر وہ حقہ بھروانے کے لیے تشریف لے گئیں

حقہ تازہ ہو کر آیا تو لطیف صاحب دو چار کش کے کرتازہ دم ہو گئے۔
 اتنے میں تمباکو کی روح انرا بڑے کے ساتھ ایک خوش بو کی ناک تک
 پہنچی، حیرت سے انہوں نے ادھر ادھر بھرا ڈالی تو پتہ چلا کہ یہ خوش بو

ایک بڑی س پلیٹ میں سے آریں نکلی جس میں آج کی ڈاکر جی نئی کچھ رسالے
تھے، کچھ خط۔

کسی زمانے میں جب وہ خود بھی جوان تھے اور دل بھی جوان کھتے تھے
ترانہ لکے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ جی ہاں بلا کے شاعر! اشعار ابھی بھی لیکن
انڈیا ریا ادائیگی کا جواب نہیں تھا۔ وہ جنون اب جی کسی حد تک موجود تھا۔ آگ
نہ تھی لکھ کی صورت، اسی سے طفیل کچھ رسالے مفت آجنتے کچھ خوشامداتہ
تعریفی خط آچکے۔ لیکن یہ خوشبو ایک لفافے میں سے آریں تھی، لطیف صاحب
کو اپنی ناک یا لفافے پر اعتبار نہیں آیا، چنانچہ لفافہ اٹھا کر ناک تک لے گئے
اور خوشبو اسی لفافے کی شرارت تھی۔

اتنے میں بیگم صاحب کسی کام سے اندر آئیں، حالاں کہ انہوں نے میاں کی
طرف بھیاں نہیں دیا، لیکن میاں نے نہایت مصافی سے لفافہ قمیض کی جیب
میں ڈال لیا، ناشہ بلدی بلدی ختم کیا اور پھر حقہ اٹھا کر اپنی نشست سماہ
گئی طرف بھاگے، دفتر سے لوٹنے کے بعد وہ باہر کے برآمدے میں ڈیرہ جایا
کرتے تھے، مردوں کی وجہ سے آج کل برآمدے کے تین جانب ٹاٹ کے پرے
ٹنگے ہوئے تھے، ایک تخت اس پر گدا، سفید چادر، گاڑی، یعنی عیدش
کا سامان یہیں بیٹھ کر وہ تھک کر گراتے، لکھا پھلکا مطالعہ کرتے، اشعار
کو فرش سے فرش پر آتے، ڈھلے، ادھیڑ عمر کے یا عمر رسیدہ دوست اور
بھلے طرح جمع ہو جاتے، گفتگو کا ابتداء یہاں یوں کے رموز بیان کرنے سے ہوتی
اور انتہا اشعار کے سننے سناتے پر۔

دوستوں کے آنے میں دیر تھی اس لیے انہوں نے دوسرے خط
پڑھ ڈالے، رسالوں کی سرسری ورق گردانی کی، خوشبو دار لٹائے کو نہیں
پڑھا ابھی وہ اس حرکت سے غصہ نہ ہو رہے تھے، زمانہ خط مسلم جوتا تھا
فینچ میں یہ شبہ بھی سراٹھاتا تھا کہ کہیں ہے وہ چھٹی کس خاتون کی نہ ہو لیکن پھر
بھی دل اڑیل فخر کی طرح دو لٹیاں جھانسنے جا رہا تھا۔

آخر موقع پا کر انہوں نے کاہنتی بولنے لگیوں سے غناذ کو لا اندر
لے گا غناذ خوشبو میں نہایا ہوا تھا سب سے پہلے انہوں نے نیچے نظر ڈال دیا
..... بے ملک رانگی کا خط تھا

محترمی، آداب

وقت سے آپ کو خط کھینے کی سوتی رہی تھی لیکن بہت
نہیں پڑتی تھی، آپ کا کلام اکثر رساں میں دیکھتی رہتی ہوں، باسطحی چاکر کا لپنے
جو بے شاہ کو چھٹی کھوں کیلین یہ سوچ کر رہ جاتی کہ نہ جانے آپ کیا سمجھیں، میرا
مطلب ہے کہ غلط مطلب نہ سمجھیں، سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے الگ نوٹ بک
بند رکھی ہے جس میں عشق آپ کا کلام جمع کرتی رہتی ہوں،

عجیب چٹھی کھینے کا بھی طریقہ نہیں ہے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا لکھ رہی ہوں
ایسی میں بل اسے میں پڑھتی ہوں، ڈرتی ہوں کہ آپ اسے میری بدتمیزی نہ سمجھیں
میں تو آپ کا رتبہ میرا ادب غالب سے کم نہیں سمجھتی لیکن آپ کی نظر میں میری رائے
کی کیا وقعت ہو سکتی ہے..... اب کچھ اور کیا لکھوں، آپ سے درخواست ہے
کہ مجھے پیش ضرور رکھیں، جو سکے تو فوراً لو بھیجیں، پتہ ذاک خانے کی مفت

میرے نام کی جگہ نسیم احمد لکھیں۔

کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو اس کے لیے معافی چاہتی ہوں۔

آپ کی..... نسیم

یادداشت کئے گئے۔ گپ شپ ہوتی رہے۔ ان دنوں کے بعد بال بچوں میں
میٹھ کر کھانا کھایا، پیگم سے ادھیڑ عمر کی پہلی بازی بھی ہوئی۔۔۔ لیکن یہ سب یوں
گنگرہم تھا جیسے خواب دیکھ رہے ہوں، پیگم دن بھر کے کام سے ٹھک رہی تھی
پر لیٹ گئیں، پہلو والے پلنگ پر میاں لیٹے تھے، چند منٹ کے بعد پیگم نہایت بک
قسم کے خلعے لینے لگیں، میاں نے پھر خوشبودار چھٹی نکال، اسے بار بار دھوا، جیسے
ایک ایک سطر کو سجدہ کر رہے ہوں، انہوں نے پیگم پر نظر ڈالی جو ان کی طرف میٹھ
کے سو رہی تھیں، گھٹے بال شانے پر ڈھلک آئے تھے، پیچ پیچ میں سفید بال بھی دکھائی
دے رہے تھے، پھر بھی اپنی عمر کے لٹاؤ سے وہ پرکشش تھیں، لیکن نسیم!
بھلا نسیم کو فوٹو کیسے بھیجیں، نہ جانے وہ نا تجربہ کار لڑکی اپنے تصور میں ان کی صورت
کھینچا نقشہ بنائے، ہمیشہ ہو، لیکن آج کل کے فوٹو گرافر بھی تو اپنے فن کے استاد ہوتے ہیں
چاہیں تو انہیں حسین اور جوان بھی دکھا سکتے ہیں، خیر شکل تو ان کی بُری نہیں
مگر عمر کا کیا علاج، فوٹو کے بعد نسیم ان سے ملاقات ہونے پر یہی سوچے گی کہ ان
چاہیے تھا لطیف میاں کو، لیکن چلے آئے ان کے آبا جی، اس موقع پر فوٹو گرافر اصل
صورت کے تضاد کی کیا کاپی پیش کر سکیں گے، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فوٹو کے
ساتھ کھدیو کر نیا فوٹو کھینچوانے کی فرمت نہیں لی اس لیے ذرا پہلے کا فوٹو
بجھوا رہی ہوں، معقول، لیکن ابھی فوٹو بیسنے کی جگہ ہی نہیں ہے، پہلے تو اس چھٹی

کا جواب دینا چاہیے۔ ظلم ہاتھ میں تمام کردہ جب کشمکش میں پڑ گئے، آواز کس طرح
 ہو مضمون کیا رہے، اور آواز کا، آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ابھی تو ایک چٹھی یوں
 ہی کھنکھاتی ہے جس میں نظر ثانی کر کے مناسب الفاظ یا فقرے لکھا جاسکتے ہیں، کم سے کم۔
 پیاری نسیم، ادب

یاد آدھی کا شکر ہے۔ آپ کی چٹھی نسیم سر کی کمرے الی اور میرا بہن
 خوش ہوئے بہر گئی۔

آپ مدت سے مجھے چٹھی لکھنے کی سوت رہی تھی تو پھر بیکاپاٹ کیسی، میں شاعر ہوں
 آپ بانی ہی ہیں کہ شاعر تلخ ہوتے ہیں۔ تلخ و دل کو جس کا بھی چاہے چٹھی لکھے اور
 میرا یہ غلط تو کھڑا ہے ہی رہتا ہے میرے لیے یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں۔
 درست ہے، خوشامد کسی بھی جہیز انسان کو پسند نہیں آتی لیکن سچی ترین
 سے کہے خوش نہ ہوگی، آپ کے ایک ایک لفظ سے غلوں کی بو آتی ہے، اس عمر
 میں آپ میرا کلام سمجھ سکتی ہیں، کوئی اصولی بات نہیں، اسی سے میں انکار دیکھ سکتا ہوں
 کہ آپ کتنی قابل اور ذہین ہیں۔

مجھے آپ کو چٹھی تو میں نے کبھی دی لیکن خوش آمد میں کہنا اگر بھیجوں گا۔

آپ کا..... لطیف

لکھ کر چٹھی پڑھی تو چند تبدیلیوں کا خیال آیا مثلاً "پاری نسیم" لکھنا مناسب
 نہیں۔ تعلقات بڑھ جانے پر چاہے....

لطیف صاحب نے فیصلہ کیا کہ دوسرے روز نئے سرے سے چٹھی لکھیں
 گے پھر وہ تداوم آئیے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اپنے آپ کو فونو گراف

کے نقطہ نظر سے دیکھنے لگے ۔

تیسرے دن دم چٹیاں اور کمبلیں جن میں بٹے امرار سے فوٹو کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کے متعلق لطیف صاحب نے پہلے ہی اتنا بہت کچھ سوچ رکھا تھا اس لیے ایک روز ایک فوٹو گرافر کی دکان میں جا گئے ، وہاں کچھ اور صاحب بھی موجود تھے لیکن ان کی معزز صورت دیکھ کر فوٹو گرافر پہلے انہیں کی طرف متوجہ ہو گیا ، فرمایا : ” میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ؟ “

لطیف صاحب بڑ بڑا گئے پھر سنبھل کر بولے ” ہمارا صاحب مجھ سے پہلے کھڑے ہیں آپ ان سے منٹ لیجئے ، مجھے کوئی ہلکی سی بات ہے ۔۔۔ میں انتظار کر سکتا ہوں ۔۔۔ اتنی دیر میں میں دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویروں کو دیکھ لوں گا “

پیشہ پر اچھا ہانڈہ کر لطیف صاحب فوٹو دیکھنے لگے اور فوٹو گرافر اپنے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا ، دل ہی دل میں لطیف صاحب ڈانڈا ڈول ہو رہے تھے ، کبھی ہی پاپا کر چکے سے ہماگ نکلیں کبھی خود ہی اپنے آپ کو ڈانٹ دیتے کہ آخر یہ کیا بزدلی ہے ،

اتنے میں فوٹو گرافر کی آواز سنائی دی ” مجھے فرصت ہو گئی ، کیجیے “
لطیف صاحب فوٹو گرافر سے نظر نہیں ملتا رہے تھے بولے ” میں فوٹو چھوڑنا چاہتا ہوں “

” ابھی ؟ “

” جی ابھی ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کو فرصت ہو تو “
” کیوں نہیں کیوں نہیں ، آخر ہم لوگوں کا کام ہی کیا ہے کون سا

”سائز؛ لطیف صاحب نے سُن رکھا تھا کہ پاس پورٹ سائز کھڑا کیمنٹ سائز ہوتے ہیں لیکن قرین میں یہ بات صاف نہیں تھی کہ ان کا طویل و عرض کیا ہوتا ہے۔ فوٹو گرافر نے دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کے سائز بتا دیئے تو انہوں نے کیمنٹ سائز پر انگلی رکھ دی۔

فوٹو گرافر نے کہا: ”آئیے اسٹوڈیو میں۔۔۔۔۔“

لطیف صاحب پچھے پچھے چلے، فوٹو گرافر تو سیٹ پر رکھے چوکور کمرے سے پھڑپھاڑ کرنے لگا اور لطیف صاحب کمرے کے کونوں میں رکھے ہوئے ایک تدرآمد آئینے کے سامنے جا کھڑے ہوئے اپنی صورت دیکھ کر دل میں کہا کہ آخر میں کیا کر رہا ہوں، یہ مونہہ اور مسک دال! ایسی کڑھی میں یہ آہل!۔۔۔۔۔ لنگھی سے بال سنوارے، ٹائی کی گرہ درست کی، پھر شراب کر اپنا ٹکس دیکھا اتنے میں فوٹو گرافر نے انہیں کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ بیٹھ گئے، فوٹو گرافر کا سر کمرے پر اوڑھے ہوئے کلمے کپڑے میں غائب ہو گیا، اور انہیں پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ اس کی دھڑکن صاف سن رہے تھے، مگر انہیں خیال آیا کہ کپیش سکل بٹوں کی قوت آگئی تو کیا ہو گا گھبرا کر کھڑے ہو گئے، فوٹو گرافر نے چادر میں سے سر نکال کر پوچھا: ”آپ سے کیا کھڑے ہو کر فوٹو کھنایں گے؟“

لطیف صاحب نے فوٹو گرافر کلن یوں دیکھا جیسے کجما اتصال کو دیکھتے ہیں۔

میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ حاصل۔۔۔۔۔ ٹوٹے مچھٹے الفاظ میں انہوں نے مدعا بیان کیا فوٹو گرافر اشلہ سمجھ کر ادا نہیں دونوں کندھوں سے دبا کر کرسی پر

بٹلاتے ہوئے بولا، آپ چننا مت کیجئے.... میں آپ کی صحبت سے تیس سال
اثر اداں گناؤں

لطیف صاحب کو فوٹو گرافر سے نفرت سی موس ہوئی گئی تھیں، کا، معلوم ہوتا
ہے کہ اس کی دکان پر اکثر اس قسم کے لوگ آتے ہیں، جب ہی تو ان کے دل
کی کیفیت کو اس قدر آسانی سے بیان کیا۔

فوٹو تیار ہو کر آیا تو اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہی پرچہ لطیف صاحب
بین رتھائی میں بیٹھ کر لطیف صاحب بار بار اسے نسیم کی نگر سے دیکھنے کی
کوشش کر رہے تھے، یہاں معقول تھا کہ تازہ فوٹو کیونچلنے کی فرصت نہیں
لی، پرانا فوٹو آپ کے اصرار پر بھیج رہا ہوں۔

نسیم نے کہا کہ فوٹو پاکر میری خوش کامیابی نہیں رہا، جو اب اس
نے بھی فوٹو بھیجے گا وہ مدد کیا، لطیف صاحب نے کہا کہ ایک گنا فوٹو گرافر میرا
واقف ہے، آپ کو ملے گا کہ اس سے فوٹو... بلکہ دونوں ایک ساتھ فوٹو کیے بغیر
گے... نسیم کو یہ طے بہت پسند آئی، اب اس کی جانب سے سلامات کے
یہ اصرار ہونے لگا، لطیف صاحب اس بات سے گھبرا تو رہے تھے، لیکن کوئی
چارہ کار نہ تھا، ان کے درشن پاکر کہیں نسیم مجھ تک نہ پہنچے یہی غم کھائے جا رہا
تھا، کہیں مجھ پر یہ نہ پڑے مجھے کہہ دیا تھا، لطیف صاحب کو آگئے ان کے آبا
مرحوم... یہاں خیر مرحوم ہونے والے

اسی آدھ پین میں وہ ایک روت کافی ڈاؤس میں کافی کی چکیاں لے رہے
تھے، دیکھا جانتی ہے کہ کافی ڈاؤس میں من پلوں کی بھیڑ رتی ہے، زیر آسمان

کوئی ایسا موضوع نہیں جس کی وجہیاں وہاں نہ اٹھائی جاتی ہوں، قریب کی میز سے کچھ آٹا لیں ان کے کانوں میں پہنچیں، اتفاق سے موضوع ان کی دلچسپی کا رہی تھا، ابی صاحب! صحت آنکھوں سے نہیں کانوں سے محبت کرتی ہے اس کا دھیان آپ کی صحت کی طرف نہیں، آپ کی باتوں کی طرف ہوتا ہے۔

یہ الہامی الفاظ سن کر لطیف صاحب بڑے محکم ارادے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے، ملاقات کے لیے ایک پارک کا انتخاب ہوا۔

نیمہ کی بلند خیال اور خوش ذوق میں شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی، جس لڑکی کو ادب سے آنا گرا لگاؤ ہو بھلا وہ صحت اور عمر دیکھنے کی یا ان کا ادب میں رتبہ اور شہرت دیکھے گی، ملاقات کے روز بن مٹھن کر گھر سے نکلنے لگے تو بیگم نے آبرو دل کو محض انداز میں جنبش دے کر پوچھا: "آج پھیلا بن کر کیاں چلے؟"

لطیف صاحب نے ایک خاص ادا سے پیشانی پر گری سرسری رنگ کی لٹ کو سر کی ایک جنبش سے چھپے چھپکتے ہوئے جواب دیا کیا پوچھتی ہو بیگم! آج کل زندگی کے نہایت خوشبودار موڑ سے گزر رہا ہوں۔

لیسے مذاق چلتے ہی رہتے تھے، بیگم پڑھیں کبھی خاتون تھی برا نہیں مانتی تھی، گھر کے دروازے کی طرف بڑے تو دل میں خیال آیا کہ کہیں بیگم کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں، چنانچہ بولے: "بیگم! باز ما فائیں نے مذاق میں یہ بات کہہ دی تم کچھ اور نہ سمجھ بیٹھنا، دفتر میں ایک میٹنگ ہے وہیں جا رہا ہوں۔"

بائز سے گزرتے وقت انہیں خیال آیا کہ نیمہ کے لیے کوئی تھوڑے پیتے تو چاہیے۔ اتنی جلدی میں کیا ہو سکتا تھا، ایک دکان کے سامنے رُکے اور کچھ

ہیں تو انہوں نے عطر کی ایک نہایت حسین ٹیلیٹی خرید لی۔

پارک میں جا کر وہ مولسری کے پڑتے پہن ہوئی پنج پر بیٹھ گئے اور انتظار کی گھڑیاں گنتے گئے، مقررہ وقت بھی گزر گیا، ان کی تجسس نظر ہر جہاں جانب گھوم رہی تھی، گرد جانے تقدیر کا ستارہ کس گوشے میں چمک اٹھے، آخر وہ لڑکی تھی، اس کا اتنی طلبی اور آسانی سے دلہیز سے یا ہر قدم رکھنا آسان تو نہ تھا۔

پارک کے گوشے سے ایک برقعہ والی آتی دکھائی دی، وہ سمجھ گئے کہ سوا سیم کے اور کوئی قانون ہو ہی نہیں سکتی۔
ان کا خیال درست نکلا، بدگنتی ٹھنکتی برقعہ والی ان کے پاس پہنچ رہی گئی، رول اپھل پڑا، آخر اس نے پہچان لیا انہیں، فوٹو اور اصل صورت میں شاید اتنا فرق نہ ہو رہتا وہ کچھ بیٹھے تھے۔
پتلون کی کریم چمکی میں ختام کر وہ سر و قد ٹھٹھے ہو گئے، آداب عرض، آداب عرض، پچھتپھساتی ہوئی آداب سنائی دی۔
تشریف رکھئے۔

وہ دونوں بچے کے دھڑوں سروں پر بڑے تلاء سے سے بیٹھ گئے لڑکی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی، لپکھلا بیٹ میں سمجھ نہیں سکے کہ گنگو کا آغاز کیسے ہو، کچھ نہیں سمجھا تو بولے وہ جو فوٹو میں نے آپ کو بھیجا تھا، پہلی ملاقات بڑی پچھتپھسی رہی، برقی ٹھنکتی لہ جان، غیر دہانی، اس رات لطیف صاحب سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جس گھڑی کا انتظار تھا وہ

کس قدر دلچسپ پاؤں آئی اور گز گئی۔ نسیم بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ اس
گھبراہٹ کے اس کی آواز تک نہیں نکل سکی۔۔۔ ملاقات سنسن غیر تھی لیکن
۔۔۔ بس !

رفتہ رفتہ لطیف صاحب نے نسیم کا پہلو بھالایا، اس کو سہانے لہجے
کو یہ کیا کہ تھا کہ ایک پر وہ دیر لڑائی گھر سے نکل کر ان تک پہنچ گئی۔ یہی
پہچان یا پہچان کر لایوسی کا اظہار نہیں کیا بلکہ پھر ملنے کا وعدہ کیا۔
حقہ کا دھواں اڑاتے لطیف صاحب نے سوچا کہ وہ دن دور
نہیں جب نسیم ان سے خوب کھٹل جائے گی۔ تب اس پہلی ملاقات کا ذکر کر کے
وہ خوب ہنسیں گے۔ پوچھیں گے "صحت نہ دکھائی تو کم سے کم اپنی سڑکی آواز
سے محفوظ رہنے کا موقع ہی دیا ہوتا۔"

چہرہ ٹھنک رہا ہو جائے گا، کیا کرتی، گھبراہٹ بہت تھی، آپ کیا باتیں
میں گھر سے کیسے نکل کر آئی دیکھ نہ لے کوئی پوچھ نہ بیٹھے، واپس پر جرح
نہ ہونے لگے۔۔۔۔۔ اور پھر آپ کا وجہ الگ۔

"میرا وجہ ا۔۔۔ کیا فرماتی ہیں، چوبیس اور کھمٹل تک میرا وجہ ا۔۔۔
ہی۔ بہت سنی پھوٹے گی، خود تیں ہی تیں خوش ہو جاتی ہیں مدتے اور ہنستے
پر ہر دم آمادہ ہونٹوں پر سکراہٹ آنکھوں میں آنسو، آخر دونوں میں ماحصلہ
ہی کیا ہے؟

اسی قسم کے بے رس خیر و مافی ملاقاتیں دو تین بار ہوئیں لیکن نسیم کا رویہ
نہیں بدلا، نہ نقاب اٹھی نہ آواز نکل، ڈری ڈری، گھبرائی گھبرائی سہیں ملاقاتیں

آخر لے پایا کہ پارک میں بیچ منی میں ملاقات ہو ہی نہیں سکتی، رہی کا ڈبہ
 ہوش کا کمرہ، کسی دوست کا گھر؟ ۔۔۔ نہیں مزا نہیں آئے گا، خطرے سے
 خالی نہیں۔

خود لطیف صاحب کا گھر کیا رہے گا کسی بھی پھٹی کے دن بچوں بچے
 کسی رشتہ دار کے ہاں جا سکتے ہیں، دھپہ پر کے کھانے کے بعد گھر سے جائیں
 اصلاحات کا کھانا کھا کر لوٹیں۔ اس دوران میں ان دونوں کی کھل کر ملاقات
 ہو سکتی تھی۔

یہ تجویز مستعمل تھی، بیگم جب موت پا تیں کسی کسی رشتے دار کے گھر کو
 چل دیتی تھیں اس لیے اگلے اتوار کو انہیں گھر سے کھینکا دینا مشکل نہ
 ہو گا، لطیف صاحب نے کہا: امید ہے کہ اس دن آپ کو کھل کر بات
 چیت کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو گی۔
 ، نہیں، نسیم نے جواب دیا۔

پہلی پہلی گنتے رہے، سینچر کے روز اتوار کا پر و گرم طے ہو گیا، ایک رشتہ
 دار کو مطلع کر دیا گیا کہ دوپہر سے رات کے کھانے تک بال بچے اور بیگم ان
 کے گھر دن راتیں لگے رہیں اور جب چہرے کے بعد یہ کام داں گھر سے روانہ
 ہو گیا تو لطیف صاحب نے اطمینان کا سانس لیا، انہوں نے کمروں کے
 فریگر اور دیگر چیزوں کو باقاعدہ اپنی اپنی جگہ پر رکھا دیا، اپنی دبیز مائن کو چھاڑ
 پونچھ کر میز کے ایک کونے میں سرکا دیا۔

نسیم نے بھی پوری تیاریاں کر رکھی تھیں لطیف صاحب وقت

مقررہ پر پارک میں نسیم کو لینے پہنچے۔ دو رکشاؤں کا انتظام تھا تاکہ راستے میں کوئی مداخلت نہ ہو۔ دو رکشاؤں کے درمیان آگے پیچھے چلے لہنے مکان کے قریب پہنچ کر لطیف صاحب نے رکشا رکوا دیئے اور نسیم کے پاس جا کر پچھپائی آواز میں بولے آپ مجھے دیکھتی رہیں، سامنے ہیں سارا مکان ہے۔ میں تالا کھول کر اندر داخل ہو جاؤں تو آپ بھی چلے آئے گا۔
 نسیم نے سر ہلا کر مایہ بھری۔

قفل کھولا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی لطیف صاحب دھڑکے ہوئے دل سے نسیم کا انتظار کرنے لگے۔۔۔ نسیم نے بھی آنے میں دیر نہیں لگائی۔۔۔ لطیف صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کا دل اچھل کر متنی میں پھنس گیا ہے۔ نسیم کو پہلو پہلو لیے وہ اپنے کمرے میں پہنچے اور پہلی بات یہی کہیں اب آپ کی اجازت سے آپ کی نقاب آٹھنے کی گستاخی کرتا ہوں۔۔۔
 نسیم نے مزاحمت نہیں کی۔۔۔ اور لطیف صاحب نے بصرہ شوق انگلیوں کی پکچلیوں میں نقاب پکڑ کر اسے الٹ دیا۔

رات۔۔۔ چاندنی میں نہانی ہوئی رات
 سانسے گیانہج کچے تھے، میاں اور گیم دونوں اپنے اپنے بستر پر سوتے
 کا میلہ کے پڑے تھے لیکن دراصل دونوں جاگ رہے تھے، ہر طرف خاموشی
 مسلط تھی، کمرے کی ہر چیز دم بخود تھی۔ چاندنی کھڑکی کے شیشوں سے جھنک
 درسی پر مری پڑی تھی۔

لطیف صاحب دل ہی دل میں بولے اچھا تو گیم! یہ تمہیں کانونہ میں

پڑھتی تھیں تو دڑا مے کھلا کرتی تھیں آج بھی فن تیار ہے مام آیا کن کن حیلوں
 سے آواز چھپاتی، صورت چھپاتی۔۔۔ آپ کہ اس اداکاری کا تو میں تامل ہو گیا
 لیکن میں جانا چاہتا ہوں کہ اپنے میاں سے جو بڑھاپے کے خاردار میدان میں
 داخل ہو چکا ہے اس قسم کا مذاق کیوں کیا۔۔۔ کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ
 بیگم آنکھیں موندے پڑی تھیں۔۔۔ وحدت یا کوب کے فنلوں میں
 بیگم جب اپنے حسن و شباب کی قربانی دے چکتی ہے تو میاں کو زندگی کے خوشبو
 دار موڑ کی سوچتی ہے کہیں سولہ تو ہے کہ میاں لوگ اس بات کی امید کیوں
 رکھتے ہیں کہ جس بیگم نے زندگی بھر قدم قدم پر ساتھ دیا وہ اس خوشبو دار
 موڑ پر ساتھ چھوڑ دے گی۔؟

بچے دوسرے کمرے میں گہری نیند سو رہے تھے اوسان کے خوابوں میں
 رنگ بڑنگ پریاں رقص کر رہی تھیں۔

گنِ پل پرِ اچھم

مسوری کی ال روڈ پر دو آدمی تار گاڑی، کو ٹونک پیٹ کر اس قابل بن رہے تھے کہ وہ سولریوں کو گن پل تک لے جاسکے، اور پھر وہاں سے انہیں مل روڈ تک واپس پہنچا سکے، میں بھی تماشاخیوں میں شامل تھی۔

مارچ کا مہینہ تھا، کلڑی اور کتاب گھرا کر زیادہ تر دکانیں ابھی بند پڑی تھیں، سینما ہاؤس بھی نہیں کھلے تھے، اس لیے کہ سیلانوں کی پیدش حاصل مئی کے آخری ہفتہ میں شروع ہوتی تھی، اس آف سیزن (off season)

میں میرے جیسے کچھ سر پھرے سیلائی بی سٹریکٹس تلپتے نظر آتے تھے، جہاں تک میرا تعلق ہے بچے خاص سیزن کی بھیڑ بھاڑ، گھبراہٹ، اور شور و شر قطعاً پسند نہیں ہے، آن دنوں بوتلوں میں ایسی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے جیسے برسات کے موسم میں موینڈکوں کی بھرمار، آج کل یہ حال ہے کہ بس یا ٹیکسی سے اترتے ہی یہ

جائے کتنے بوتلوں کے گلائیڈ اٹھ باندھے کمرٹے دکھائی دیتے ہیں، یہ احساس کتنا خوش گوار ہوتا ہے کہ اس پردیس میں بھی آپ کو خوش آمدید

کہنے والے موجود ہیں، کچھ دیر تک آپ ان کی خوشامد چاہو سی اور چرب زبان سے تھوڑا ہنسکتی ہیں، اور جب آپ کس ٹہل میں پہنچتی ہیں تو کانوں میں غرغریاں اور دھڑکنے والی دھڑکنے لگتی ہیں،

ہوشیار باش! خبردار! رفیع سلطان کی سواری آ رہی ہے۔۔۔

سیر کو بلائیے، سنان نکلیں! اپنے جہاں جی چاہیے بیٹھے محسوس ہجے چاہیے،
 ٹپٹے۔۔۔ کوئی پوچھنے والا نہیں، گھنٹیں، کوئی ہانک جھانک کرنے والا نظر نہیں
 آتا۔۔۔ اُٹ! مرو کی سرشت کو کیا کیئے! مجھے محسوس ہوا کہ تاشائیوں میں سے
 ایک نوجوان کھٹکلی بازو سے میری طرف دیکھ رہا تھا، طبیعت حساس ہو تو مرد
 کی نظر کی حدت یوں محسوس ہوتے گتے سے پیسے آتش ٹپٹے میں سے گزر
 کر تنگی جلد پر پڑتے والی سوزن کے کرنیں کیکن وہ شخص خاصہ مستعد نکلا، کیوں
 کہ ہنر ہی میں نے اس کی طرف دیکھا، اس نے فی البدیہہ ہر رخ دوسری طرف
 پھیر لیا۔

اس کی صورت کچھ انوس سی محسوس ہوئی، یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے
 کہاں اور کب دیکھا تھا۔۔۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کہیں یہ لاشعور کا کرشمہ تو نہیں
 ہے، نفسیاتی لحاظ سے کہیں لاشعور ہی طور پر کسی سے بات کرنے کو ہی چاہیے
 تراغذ گنگو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ۔۔۔ آپ کا شکل جانی پہچانی سی مسلم ہوتی
 ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا لاشعور اس نوجوان سے متعارف ہونا چاہتا
 تھا ابی تو یہ! منہ دستانی لڑک چاہیے کتنی بھی موڈ ۵۵ ۵۵ بننے کی کوشش
 کرے وہ سیتا اور سادھری کی چھاپ سے معرا ہو ہی نہیں سکتی بالخصوص
 اس صورت میں جب کہ اپنی زلف پر پیچ میں کسی اور مرد کا دل آویزاں کر رکھا
 ہو۔ مانا وہ ہر جانی نکلا، لیکن دل کے نہال خانوں میں اب بھی اسی کی ذات مستور
 تھی۔۔۔

سنا خیال آیا کہ میں وہاں کھڑی کھج کر رہی تھی جب موڈ، آلتھ نامتو، ہو رہا۔
 ہو تو انسان دیدہ و دانستہ اکتا کھاتا چلا ہے، کہیں ڈگڈگی بجت رہی تو رک
 گئے، کہیں کس صاحب، چھترہ سیم چورن نے غیب لگا رکھا ہے تو ایک گئے کہیں
 بموٹائی متفرقات کھٹ بھی ہے تو برمال پر گئے آنکھیں پھوٹنے، یہی موڈ
 اس وقت ہو رہا تھا، تار گاڑی سے بچھ کرئی نامی ملتی نہیں تھی، غیب دیکھا
 تو بگ گئی، آٹھ گن بن پیدل بھی جاسکتی تھی، راستہ بھی طویل نہیں تھا، کیا بدقوق
 تھی کہ ہاٹل کے نیچے کی جانب دون کی داسی پر نظر دوڑا اگر کیف چل کرے
 کے بجائے تار گاڑی کو تار کے بار ہی تھی۔

میں آگے بڑھ گئی، کچھ ہی نامی پر پلٹن پارک تھا، بچوں نے اوجھم چپا
 رکھا تھا، اوروہ جو کہیں زہر تھیں اب بچوں کو کچھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں
 البتہ آٹھ گن یا تو بلیں کھا رہی تھیں یا اپنے تھکے کرید رہی تھیں،
 وہاں پندرہ میں منٹ تک رک کر میں نے غصہ ہوئے کی ناکام
 گشتی کی جب یہ احساس ہوا کہ فروش ہوتے کے بجائے میں اڈ رہی
 ہوں تو سوچا۔۔۔ اے دل، اب کہیں اور چل !

کچھ دُور جا کر سڑک کے کنارے کسی ڈوگر لڑکی شوٹ ہوئی۔
 (www.wwww) کے ماتھے تک گئی، دس پندرہ منٹ فوٹر دیکھنے میں گزر گئے
 کھڑے کھڑے ہر شک گئے تو ہی چاہا کہیں بیٹھ کر چائے پی جائے مگر کہاں؟
 تب اوپر گن بن کر جانے سنا خیال آیا جہاں ایک اچھا ناما رستہ ملتا،
 ایک بار پھر وہ گم کردہ ماہی کی طرح چل پڑی، کتاب گھر یا تار سے

کافی اور صراحت راستہ گنہگار کو جانتا تھا اسی پر مبنی۔

اسنے میں گھاٹی سے بادلوں کا فیل اور کپڑا آٹھ آیا، ہر طرف دھند چھا گئی، بوند
 باندی جوتے لگی، آدھا راستہ طے کر چکی تو سیکھایک بارش تیز ہو گئی، اس پاس کی
 چیزیں بھی واضح طور پر نظر نہیں آتی تھیں۔ آگے بڑھنے کی ہمت چھوٹنے لگی لیکن
 واپس جانے سے بھی کیا حاصل؛ اپنا پھوٹا سا پانیہ آگے کو بھٹکا کر دھتی چل گئی
 سنا پاؤں پر پٹ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں اس راستہ کے بالکل سرے
 پر تھی، سوچ کر گھبرا گئی کہ اگر مستقبل نہ پائی تو ایک پر لازمی طور پر لوٹ جائے
 گا میں مستقبل نہیں پا رہی تھی کہ اسنے میں کسی نے جھپٹ کر میرا بازو تھام لیا اور پھر
 مجھے ادھر کھینچ لیا۔

کون تھا میرا محسن؟ ... وہی بھوتہ گھڑی کے شع میں بیٹھے گھور سا قادیان
 غلی اتھاق تھا، پر ٹوٹنے سے بچ گیا لیکن یہ سرفکر کونف ہونے لگی کہ کس کے
 پتنگل میں آجھنسی!

اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کیا۔ ”ادھر چلے، جب تک مر سلا
 دھار بارش سے پہلے پناہ مل جائے گی، یہ کہہ کر وہ چل دیا، مجھ سے بھی اس
 کی رائے منی پڑی، میں پر تڑپوں نے سنا پناظرہ سول لینے کو تیار نہیں تھی
 بڑے بڑے بے فعل چھروں کی ایک ہی قطار میں چند کوٹھڑیاں بچا ہوئی
 تھیں جن کے آگے ایک طویل برآمدہ تھا، یہ کوٹھڑیاں غالباً سامنے دے بگلتھ
 کے ایک کے نوکروں کے لیے بنائی گئی تھیں، حالانکہ اس وقت وہاں کسی
 عروا کوئی نہ تھا۔

اس نوجوان نے مردِ مہرِ طرفِ دیکھا تک نہیں، وہ کچھ نامکمل پر میری
طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا میں نے جگران کا شکر کیا اور اوجھڑے گوشے
میں کھڑی ہو کر دھندلے پہاڑوں کو دیکھنے لگی۔

کبھی کبھی میں دُورِ دیدہ نگاہ اُس پر بھی ڈال لیتی تھی کہیں وہ میری طرف
دیکھ تو نہیں رہا ہے، لیکن وہ اُسی طرح کھڑا تھا، اس نے پر ساقی پہن رکھی تھی
سبز نکھار تھا اور پاؤں میں گم بوٹ تھے،

کچھ منٹ گزر گئے، رفتہ رفتہ بارش دھبی ہونے لگی میں نے سوچا، شاید
اب وہ ضرور مجھ سے کچھ کہے گا، لیکن وہ کچھ نہ بولا۔

جب بارش نے خوش گوار خیمہ کار کی حالت اختیار کر لی تو وہ پٹا میں سنبھلی
لیکن وہ ایک نلٹے سے میرے قریب سے ہو کر پتھر پر راستہ پر پہنچا اور
پھر گن بلی کی طرف ہٹنے لگا۔

مجھے بہت بُرا لگا، بدیشہ کہیں کا! اپنے آپ کو نہ جانے کہاں کا دھرمیو

یا امتیجہ بھتا تھا، میں بھی برادے سے اتنی دل میں آیا، دل میں ہوں پاؤں، پھر
طیش میں اگر سوچا میں اس مرد سے دوستی ہوں کیا!

اور پہونچی تو راستے گن بلی کا میدان پھیلا ہوا تھا، میں کہے پرے کا صے
پر ایک چتر سا دکھائی دے رہا تھا، اس سے پہلے دائیں بائیں کو تار گاڑی کا ڈھ

تھا، اور اُسے سے بھی پہلے رستوران تھا، ہمارے میدان میں مرد کی شدت
اور جگہ بڑھ گئی تھی کیونکہ چاروں طرف سے آنے والی ہواؤں کے آگے کوئی رکو
ہیں تھی، ٹھنڈک کے احساس سے گرم گرم چائے کی طلب اور بھی بڑھ گئی،

رستوران تک پہنچی تو دیکھا، میز امن دھلاے میں اندر کی طرف منہ کئے
 کھڑا ہے۔ پہلے تو تنگی، پھر سوچ کر آگے بڑھ گئی کہ آخراں میں چمکا پاتے
 کبات ہی کیا ہے۔

اس کے پہلو تک پہنچی تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا: بسا رستوران
 میرا پٹا ہے۔ مرنے کی بجائے میرے خیال میں آپ ہی وہاں بیٹھے جائیے۔۔
 تھوڑی دیر میں کوئی اور میز خالی ہوئی جائے گی۔

کہہ کر وہ بٹھا اور میرے پہلو سے نکل کر باہر چل دیا۔

کسی منظر کی کیفیت کے تحت میں نے آواز دی: "سینے۔"

وہ کار میں نے پھر کہا: "جوتھی ہے۔ بہت تک کوئی اندر میز خالی نہیں ہو جاتی
 ایک ہی میز پر بیٹھے ہیں کیا حرج ہے؟"

اس کے چہرے سے کسی بھی کیفیت کا اظہار نہ ہوا اس نے بے اعتنائی
 سے اپنے کندھوں کو حرکت دی اور غلامی کی طرف بڑھ گیا،

میں اس کے مقابل والی کرسی کے قریب کھڑکی کے سامنے کھڑکی
 ہو گئی۔ نہ جانے کیوں اس کے ساتھ ایک ہی میز پر چائے پینے کو ہی نہیں چاہ
 رہا تھا، کھڑکی سے باہر پھوٹا منظر دیکھنے لگی۔

بیرایا تو اس نے کہا: چائے۔

تھوڑی دیر بعد بیرا چائے کے دو پیالے میز پر رکھ کر ہٹا گیا، میں نے
 سوچا اب تو چائے زہر مار کر ہی پڑے گی پہلے میں اُسے دل چیک انسان بھی
 مٹی، اب وہ مجھے بہت بدتمیز، بے ہودہ، اور غیر مہذب انسان معلوم ہو رہا

کرسی پر بیٹھے ہی میں نے دیکھا اس نے ہیلے کے کنڈے میں اٹھی ہین ڈال، کنڈے ہی کو پکڑ کر پالہ اٹھایا۔ آدابِ نقاست کے لحاظ سے یہ اچھی بات تھی۔

جس جگہ اتنی بڑی تعداد میں لوگ بیٹھے ہوں وہاں یہ تو ناممکن تھا کہ ان کی نگاہیں کس ذہوان فویر روٹ کی طرف نہ اٹھیں۔ مجھے ایک بے صبر انسان کے مقابل پُپ پاپ بیٹھے دیکھ کر وہ نہ جانے کیا غور چنے لگیں، آخر ایسی بھی۔ فرعونیت کیا؟ اندر ہی اندر میں کھولنے لگی۔ نہ رگایا تو میں نے بے ساختہ تکیہ کیا۔ آپ آج گھر سے خود کشتی کا تہیہ کر کے نکلے تھے نہ؟

اس کے ہنر ٹول پر سبم سی سکراٹ پیدا ہوئی اور وہ بولا: میں سمجھا تھا آپ کسی اجنبی مرد سے گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھیں۔

۱۰۔ اجنبی مرد کیا، میرا تو مروتات ہی پر سے اعتبار اٹھ چکا ہے۔

۱۱۔ سبب کیجئے، آپ کا نظریہ بہت بوسیدہ اور گھسا پٹا ہے۔

اس طرح گفتگو کا آغاز ہوا، اور پھر مابین درمیان فضا کسی قدر خوش گوار ہو گئی، ایسا جی ہوتا ہے کہ کسی اجنبی جگہ پر کسی اجنبی سے ہم بیٹھ کر ایسی باتیں بھی کہہ ڈالتے ہیں جو عام حالات میں اپنوں سے کہنے میں تامل ہوتا ہے۔ مروتات سے اعتبار اٹھ جانے کی وضاحت کے سلسلہ میں دل کی بات زبان پر آگئی۔

اس نے بہتنجیدگی سے کہا: آپ مجھے پابندی تھیں اے کسی اجنبی روٹ کی

تو میرا ”بم پیار“ پھر بولا ”اس کی چننا مت کیجیے“ میں نے بن ادا کر دیا ہے ۔“
 اب میں رک نہیں سکتی تھی کچھ لو کہے بغیر میں رستوران سے باہر نکل اور آگے
 بڑھ گئی ، تار گاڑی اور پہنچی تو مسافراتن گئے ، میں دیدہ دو اندستہ یوں پکی جیسے گاڑی
 پر سوار ہونے کی جلدی میں تھوں ۔

اسی دوران سونج نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”سنو!“
 نہیں نے انتہائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا ”ارے تم؟“
 ”صاف کرنا میں ذرا جلدی میں ہوں ۔“

اس نے میرے کندھے پر اپنی گرفت ذرا مضبوط کرتے ہوئے کہا ”صاف
 کرنا ، ابھی میں تمہیں جانے نہیں دوں گا ، میں تم سے ہی زیادہ جلدی میں ہوں!“
 میں رک گئی ، رکنا چاہتی بھی تھی ۔
 اڈے سے نکل کر ہم ذرا فاصلہ پر میرے کی طرف بڑھے ، پھر ارباب بھی گاتار
 گر رہی تھی ۔

جب ہم پھت کے نیچے پہنچے گئے تو میں نے اس سے آٹھکھ ملائے بغیر جیسے
 اقبال جرم کرتے ہوئے کہا ”میں نام ہوں سونج ، محض ایک بار کسی رڑک کے ساتھ
 تمہیں دیکھ کر مجھے اتنی جلدی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے تھا ، میرا زمین تھا کہ
 میں تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقعہ تو دیتا ۔“

”ادھ ! تم اتنی سمجھدار کب سے ہو گئیں ! خیر ! تم نے تو مجھے موقعہ نہیں دیا ۔
 لیکن میں تمہیں صفائی پیش کرنے کا پورا پورا موقعہ دوں گا ۔“
 چونکہ کر میں نے اس کی طرف دیکھا ، کس بات کی صفائی ؟

اس نے گھور کر میری طرف دیکھا اور غزا کر بولا " یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے ، تم نے بغیر مرد کو اپنے بازو میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت کیوں دی ؟ "

" ادھر ابیب میں گئی پہلی کو آ رہی تھی کہ یہ حضرات میرا پیچھا کر رہے تھے " میں نے جواب دیا " میں پسپا ہو گئی تھی ، اس نے مجھے صرف مبارک دیا ، یہ سب اچانک ہوا ، ہم پہلے کبھی نہیں ملے ۔ "

" خوب ! لیکن میں جان سکتا ہوں کہ اس کے بعد تم سیدھا راستہ چھوڑ کر اس اجنبی کے ساتھ کہاں چلی گئی تھیں ؟ "

یہ کھلم کھلا الزام سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی ۔ اب تو اپنی رشتہ میں میرے منہ سے الفاظ کا لاوا بہہ نکلا ۔

" منوج نرم پڑ کر بولا " چھوڑ دو ان باتوں کو ۔ مجھے تم پر تو پورا اعتماد ہے ۔ آؤ ! سامنے والے رستہ پر ان میں چلیں ۔ "

" میں نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا " وہاں جانا ضروری ہے ؟ کہیں اور کیوں نہ چلیں ۔ "

اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا " اس لیے کہ وہاں وہی زوجہ ان بیٹیا ہے ! "

میری آنکھیں نہ نم ہو گئیں ، گلوگیر آواز میں بولا " تبہیں اب بھی اعتبار نہیں آیا ؟ "

وہ ہنس کر بولا " میں تم پر یقین کرتا ہوں ، کیونکہ وہ تمہارا دیور

مجھے توں غصی ہوا بیسے میں دہیں گرہوں گے تیرے دہی امر کی دلا ہونا بالی
سے تہا را ہیں ستم اکٹھا کر کیا کرتے تھے :

۱۰ ماں :

”تم دونوں بڑے سازش بکھے، میل بچا کرتے ہوئے مسخری چلے آئے!“
میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے ،
دوبلا : دیکھو دوسرے لوگ رہ رہے ، پورے تہا را آنکھوں میں ریم جم رہا

بند رہا ہے ۔

میں نے آنسوؤں کی چین میں سے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا ۔
اس نے میری پیٹ پر کئی سی ٹپکی دیتے ہوئے کہا : اب تو تمہیں دیاں پٹنے
میں کئی اعتراض نہ ہونا چاہیے !

چپ چاپ میں اس کے ساتھ بھول ، ریسٹوران کے دروازے پر پہنچنے سے
پہلے وہ رکھا اور کہنے لگا : ارے ہاں ! اپنی صفائی پیش کرنا تو میں بھول ہی
گیا ۔ ۔ ۔ وہ لڑکی جو تم نے میرے ساتھ دیکھی تھی وہ تہا را دھند کی سنگیتر ہے
یاد ہے ؛ میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ صرف شادی کی ٹاٹر کچھ دنوں کے لیے
انڈیا آ رہا ہے ۔

گھر کا راستہ

ایلیا! آپ اپنے سے میں کیا؟

یہ سوال کرنے والی آٹھ برس کی بچی تھی، اُس نے چکدار بھولوں والا انگلیں
 ذرا کپڑے رکھا تھا، چھوٹے چمکے ہوئے کاسے بوٹوں میں سے محل کر سفید مونسے
 گداز پندھیوں کو پھوڑے تھے، اس کی موٹی سرنگیں آنکھوں میں تجسس کی جھلک
 تھی، اور گودے گنگالی پرے سے مصروفیت چمکتی تھی

بچی تین خوش پوش تھی، بابا کے کپڑے اتنے ہی بدنام تھے، اس کا کوٹ چمرا
 ہوا تھا اس پہلوں کی موت کریم ہی ثابت دتھی، وہ پانچواں سے نہیں بدتر معلوم ہو رہی
 تھی، چہرے پر جھریاں کاجال بچھا ہوا تھا، وہ ناپنا خیریں تھا، البتہ اس کی آنکھیں
 کچھ پل اور گدگد تھیں اور ان میں نور کی دمک کا شائبہ دمک نہ تھا

اس نے جھک کر نیچے کی طرف دیکھا، بچی کی آواز میں اُسے جلدی کا احساس
 ہوا اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بچی نے دوسرا سوال کر ڈالا کیا آپ اپنے
 گھر کا راستہ بھول گئے ہیں؟

ہاں میا! میں راستہ بھول گیا ہوں گھر کا

اُسے اتنا تو یاد تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی گھر ضرور تھا، ورنہ راستہ بھول جاتا
 اس سوال ہی پیدا نہ ہوتا، کوماغ دھواں دھواں ہوتا تھا، ابھی تک اُس نے

گھر کا راستہ بھول جانے کو زیادہ اہمیت دی تھی لیکن بچی نے اُسے اس بات کا احساس دلادیا۔

”تو اس میں پریشانی کی بات کیا ہے، چلو! میں تمہیں گھر تک پہنچا دوں۔“
 اُس نے بچی کو پیٹے کبھی نہ دیکھا تھا، یا پھر اس کی صورت اُس کے ذہن سے
 آڑھ کی تھی۔ وہ اسے پہچان نہ پایا، غالباً وہ اُس کے پڑوس میں رہتی ہوگی، وہ
 اسے کمر کھانسی کھانسی کر ٹہکتے ہوئے دیکھتی ہوگی، اُس کے چہرے سے خود
 اعتمادی ٹپکتی تھی۔۔۔ بلاشبہ وہ اسے جانتی ہوگی۔ ادا ہے گھر تک پہنچا
 دے گی۔

”بیٹی! تمہارا نام کیا ہے؟“

”بے بی۔“

بچی کی مادہ گو پر اسے پیار آنے لگا۔ بے بی کے اصلی نام کی جستجو بے سود
 تھی، ہو سکتا ہے اُس کے پھر پوچھنے پر بے بی کہہ دے، تو کیا آپ یہ بھی بھول
 گئے کہ بے بی کون ہے؟

بے بی نے سر کے ایک ہی جھک سے نوب مرز کے کٹے ہوئے اپنے گھنے
 بالوں کو پیچھے کی طرف پھینک دیا، اُس کے کندھے بالکل سیدھے تھے اور اس
 کا سپاٹ سینہ سنا ہوا تھا، وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی رقعاتی شاڈا
 گڑیا اس معلوم ہو رہی تھی، اس کے پاؤں پھولوں کے سے سبک اندازے زمین کو
 چھو رہے تھے، وہ زمین کی سطح پر ترق ہوئی اس معلوم ہو رہی تھی۔

اس نے بے بی کے پاؤں پر تتر جا رہی۔۔۔ وہ پاؤں جو ہاتھوں میں پناہ

گزیں تھے اس شاہ راہ پر بے شمار پاؤں۔ انگشت جھٹکتے رداں وداں تھے ،
 چوتھے بھی کئی رنگوں اور کئی ڈیزائنوں کے تھے جب بہار تھی اُن جوتوں کی ۔
 کچھ دیر بعد ان جوتوں کے جوم میں بے بل کا پتہ نہ تھا یا وہ آگئے نکل گئے
 تھی یا بھیجے رہ گئی تھی ۔

اُس نے رکنے کی گوسٹا شس کی بسکین انسانوں کے اُس بہاؤ میں ایک
 جگہ پر رکے رہتا بھی اس کے لیے ناممکن تھا ۔

انسانوں کے تیز و تند پیلے ہیں وہ تنکے کی طرح ہٹا چلا جا رہا تھا ۔

آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ بسکین کی طرف سے ایک بڑا سا کالا بادل
 ریکچ کی طرح منہ اٹھائے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چشم خون میں سورج اس
 کے کھلے ہوئے منہ میں آگیا ، تازت کی جگہ وضائیں کئی کئی گھل گھل گئی ۔

وہ بیڑ بھاڑ میں سے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں ملد رہا تھا۔ اس کی جسمانی
 قوت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی ، وہ گر بڑا گیا ۔

اُسی وقت اسے ایک جھپکتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی ۔ "ہائی ویش !"
 پھر مردانہ آواز : "ہائی موٹی !"

اُس نے دائیں طرف زنگین کرتہ اور عزارے اور پانچواں جیسی بڑی
 موہری والی پتلون زیب تن کے پیشہ باز فوجوان کو کمرے پایا جس کی فکر اُس
 کے بائیں جانب کھڑی ایک راک کی پرچی ہوئی تھی جو بیل باٹم میں ملبوس اپنی نیم
 آنکھوں پر پیشہ پر مٹھائے تھی ۔ چشمے کے ٹیپے پھوٹا ہنٹری سے چھوٹے
 نہ تھے ۔

اُن نوجوانوں نے ایک اولڈ فیلین کو اپنے درمیان حائل ہوتا دیکھ کر اضمحلال کا اظہار کیا۔ پھر بائی دیش نے اپنے منہ کے دانت کراس کاٹ سے اس کاٹ تک کینچتے ہوئے کہا: "زحمت نہ ہو تو راستہ پھوٹیں۔"

اولڈ فیلین ڈرہاٹھا کہیں وہ بھی نہ پوچھ بیٹھیا کہ آپ اندھے تو نہیں؟ اس لیے اس نے جلدی سے جواب دیا۔ "میں اس بھیڑ میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔" بائی موئی بولی "پُور اولڈ فیلو! — چلو دیش اس کی گھیر سے باہر کر دیں۔" دیش نے اس کا بازو تھام لیا اور دوسرے ہاتھ میں موئی کا ہاتھ لے لیا۔ وہ دونوں مشہور اداکارہ جان جہاں کی اچانک موت پر اظہارِ تاسف کر رہے تھے۔

درمیانِ ہوا سے باہر بھی بیشمار انسان رنگین کیڑے مکوڑوں کی طرح اُدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر دیش اپنے چہرے پر مردانہ تیور پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "آپ کو جانا کہاں ہے؟" "نہیں گھر کا راستہ بھول گیا ہوں۔ نیاں کامریض ہوں۔ پل بھر پہلے کی بات بھی بعض اوقات یاد نہیں رہتی۔ بازار میں کھڑا ہوں، خریدار نہیں بولتا۔ یہ بھکی بھکی باتیں سن کر موئی نے اپنے سر پر تکی انگلی رکھی اور اسے پیچ کس کی طرح گھما کر اپنے سامنے کو سہایا کہ اولڈ فیلو کے دماغ کا کوئی پیچ یقیناً ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ اور پھر بلند آواز سے بولا "کیوں نہ ہم انہیں اٹکے گھر تک پہنچا دیں۔" "ہاں! ہاں!"

نئے خضر راہ پاکر اولڈ فیلو ان کے ساتھ ساتھ ہو گیا ،
 سورج ایک بار تو ریچ نہا بل کے منے سے بھل رہا تھا لیکن پلورب کی
 جانب سے فوج کرم اسٹن گھٹا کے تیور فلز ایک دکھائی دے رہے تھے ،
 دھوپ کی شدت سے پہرے تھما رہے تھے ، نہ جانے کتنے پہرے ..
 ۳۱ ، سالے ، گدے .. اور بدن بن جانے لگے بخان بدن ... دھیلے
 قحطے کرتوں میں ہنر کن گولائیاں ... گداز کو بے ،

اپنی رانست میں وہ توجہ ان جوڑے کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا پتے پتے
 اس نے غصوں کی اس کے قدم رکھ کر رہے ہیں چہرے غصوں ہو جیسے وہ گرنے
 کو ہو اور شاید وہ گریہ جاتا اگر اسے آگے بڑھ کر کوئی قحط نہ لیتا ۔

اسے بڑے بڑے پیلے راتوں کی جھلک نظر آئی ، اویٹر آدمی کا چہرہ
 اس کے سامنے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کاسٹ کا بنا ہوا ہو لیکن وہ کاسٹ کا
 آئینہ نہیں تھا ، تیر تیرتا تھا ، کہ وہ ماڈرن ٹائپ کا سیٹھ تھا ، وہ کلین شیوڈ تھا
 لیکن چہرے پر کالی راکھ ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی ، غالباً اس کی دائرہ صلی کے بال
 مونے اور گھٹنے تھے ، اس کے دانگ گانٹھنوں میں ہیں بالوں کا جنگل سا
 نظر آرہا تھا ، گماگماہتہ میں تھا اسے وہ بے حد تھکس سے پاروں طرف
 دیکھ رہا تھا ، اُسے غصہ کسی کی تلاش تھی ، یا وہ کسی کا منتظر تھا

ان دونوں کی بات چیت بھی چولی ، سیٹھ نما بنگالین نے بار بار رومال
 سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ،

”میری کار کھڑی ہے ، بس ابھی پلٹے ہیں ، چٹائی لڑی بات نہیں

بابا جی بھی اطمینان سے ایک دیوار یا جگہ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو
 گیا، چلیاقتی دھوپ میں ایک طویل کار سڑک کے کنارے کھڑی دھول
 بھاگ رہی تھی، کار کو کچھ دیر دیکھتے رہنے سے اس کی طبیعت اُٹھ
 گئی، اس نے آنکھیں موند لیں، تاکہ ان کی تکان ذرا دور ہو جائے۔

نہ جانے وہ کتنی دیر تک اونگھتا رہا، جب چونک کر اس نے آنکھیں
 کھولیں تو اس کے سامنے ایک پوہلی سی مسکراہٹ سپاتی چل گئی، پہلے تو
 وہ سمجھا وہ اپنے میں اپنی ہی صورت دیکھ رہا ہے، لیکن یہ غلط فہمی دوسرے
 ہی لمحہ دور ہو گئی، وہ اس کا ہم عمر کوئی اور تھا، درود، کار والا، غالباً اسے
 اونگھتا دیکھ کر رخصت ہو گیا۔

دونوں کی ٹھہری ٹھہری آنکھیں ایک دوسرے سے ملیں، درودار نے کہا
 "پہلے تو بھڑ بھڑا میں سے نکلتا چاہیے مہاراج!"

بھڑ میں سے نکل کر دونوں کی پوہلی باتیں شروع ہو گئیں،
 اپنے ہم عمر سے باتیں کر کے مہاراج کو یک گونہ لکھن کا اسکاڑھوانے
 سامنے لے گیا، تو کیا ہوا، ہاں الال آپ میرے گھر چلیے نا؟
 وہ اس پریش تیار ہو گیا مگر ہوتا ہے اپنا ذہن، دوسرے کا ہسی
 بے درد دیوار تو نہ ہو گا، در نہ گھر کیسا!

آسمان پر بادلوں کا سہارا۔۔۔ جسے رکھپوں کا کاہواں کہیں
 پابے۔ بڑے زبرد سے چنگھاڑتا ہوا سورج پر چڑھ دوڑا، آفتاب غائب

کی حالت عذوب آفتاب سے بھی بدتر ہو گئی، ریش روشن پر تہہ در تہہ دیر
پردے گرنے لگے۔

پلتے پلتے نور اور نور کی سپل دا لے بوڑھے نے پوچھا کیا ہوا ہے؟
"وہی جو آپ کو پہلے ہی سے ہو چکا ہے؟"

یہ سن کر بوڑھا دل ہی دل میں مسکرایا۔ ہونٹ مسکان زدہ ہونے کے سبب
مسکراہٹ کا بار بار ثبوت کرتے سے ظاہر تھے۔۔۔ تو یہ حضرت بھی اپنے گھر کا راستہ
نہیں جانتے؟ یا بھول گئے؟ یا انہیں نکلے نہیں تھی کہ وہ راستہ سے واقف ہیں۔
فضاؤ میں تھک چکا ہوا تھا، پر زور ہوا کے جھونکوں سے پاؤں اکھڑے
جاء ہے تھے۔

بارش کا آواز ہونے ہی کو تھا۔

نور نے اپنی میلی پتلون کی جیب ٹٹول کر درمزیل سے سگریٹ نکالے
اور ایک اپنے ساتھی کی طرف بڑھایا۔ دونوں کے چہرے چہرے کی طرح
خشک اور سکڑے ہوئے تھے، چند لمحوں کے بعد ان کے منہ سے دھواں
نکلنے لگا، جیسے بوسیدہ قبر کے روزن سے نکل رہا ہو۔

بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں، لوگ تتر بتر ہونے لگے، ان گنت زلیخیں
بہا ئیں، رنگ برنگے کرتے اور تہ بند جواہر پہنچڑھائے، "اوئی! اوئی! کاشدہ
تھا کہ تیرم کا سمندر"

وہ دونوں پہلی پہلی مانگوں کو اور مراد مرید کے ہونٹ بے ڈھنگے انداز سے
بھاگے۔

مڑک کے اس پار زمین کا ایک ایسا ٹکڑا تھا جس پر رنگ خوردہ لوہے کی چادر ہی سا یہ فلگن تھیں، کہیں یہ بس کا اڈہ تھا، لوگ یہاں 'کیو' بنا کر کھڑے ہو جاتے، اپنی بس کا انتظار کرتے، جب بس آتی تو اچک کر اس میں بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے گھر کو روانہ ہو جاتے، لیکن اب یہ اڈہ سنان چڑا تھا، وہاں کوئی بس نہ رکھتی تھی، کوئی سواری بس کا انتظار نہ کرتی تھی۔

وہاں پہنچتے پہنچتے سبز بارش ہونے لگی، گھیلی سڑکوں پر تیزی سے تھرتھاتی ہوئی رنگین کاریاں جل پریاں سی معلوم ہو رہی تھیں۔

وہ دونوں بس کے پرانے اڈے پر پہنچ گئے، جہاں ایک بوسیدہ پنچ بھی تھی، جس پر وہ بیٹھ سکتے تھے، اور رنگ خوردہ آبنی چادروں کے نیچے بارش کی بوچھاڑ سے بچ سکتے تھے۔

جتنی تیزی سے بارش کا دیلا آیا تھا اتنی ہی تیزی سے چل رہی گئی، لیکن اتنے ہی میں ہر طرف جل تھل ہو گیا، تھوڑی دیر میں رگ سڑکوں پر نکل آئے۔

وہ دونوں اڈے کھڑے ہوئے، اب تک ان کے دماغ گھر کے سامان میں جیسے طاق نسیاں ہی پر رکھے تھے اتنے میں سامنے ت ایک بچہ گاڑی آتی دھماکے کی آواز سنائی دی، آگ کی کڑی سی معلوم ہوتی تھی، اور بچے کا ہاتھ سے بچکے کپڑوں میں لپٹا ہوا ٹماٹر۔

انہوں نے بھک کر بچے پر نظر ڈالی تو اس کے غصے ہوئی ہوئی پر سکراہٹ پھیل گئی۔

اس کی اس سکراہٹ میں ایسی طمانیت اور نورانیت تھی جیسے وہ

ازل سے ابد تک کے سبھی راسخوں سے یزیدی واقف ہو، شاید تھا بھی!۔

شکریہ

اللا

میں مہرا میشن کی شاندار بلڈنگ کے آگے سڑک پر گھڑی تھی.....
بلڈنگ کی پہلی منزل سے لے کر اوپر تک الگ الگ کپڑیوں کے دفتر تھے جن
کے سامنے بورڈ آسانی سے پڑے جا سکتے تھے، مجھے ایم کے لال اینڈ سنٹر
کے دفتر میں جانا تھا۔

سوچا تھا کہ لفٹ کے رسیں اوپر پہنچ جاؤں گی، لیکن جب دور ہی سے
لفٹ میں دو مرد دکھائی دیے تو ارادہ بدلنا پڑا، اور انہی ایڑیوں کو کمر
کٹائی میں زینہ سے اوپر چڑھنے لگی۔

گیارہ جولائی کا دن تھا، جس کے سبب جسم پسینہ سے تر ہو رہا تھا، زینہ
پر پڑنا پڑا تو پسینہ در بھیڑی سے بہ نکلا، دفتر کے صدارت کے قریب پہنچ کر
دکھائی سہاگم بھی تھے، وہیں ادھر پسینہ بھی تھوڑے خفکھف ہو رہا تھا۔

گھڑی دو گھنٹہ کے بعد بڑے دروازے کو دیکھ کر اندر پہنچ کر ایک
طویل دغوبھ ہال میں کئی میز پر نظر آئیں جن کے قریب کرسیوں پر بیٹھے بابو
صاحبان اپنے اپنے کام میں مصروف تھے، داپنے کونے میں پوچھتا پوچھتا
تفتی آدمیاں تھیں، وہاں پرانی پیرمی کے ایک بزرگ بابو صاحب براجمان تھے،
میں نے مینبر کا نام لے کر پوچھا، "سائیں صاحب کہاں ہیں گے؟"

ان کو غالباً اونچا سنائی دیتا تھا، کان کے پیچھے ہاتھ کا پیار سا بنا کر انہوں

نے گردن آگے بڑھائی، ایک آنکھ سکیڑ لی، اور نیم دار مسند سے میرے آنے کا سبب پوچھا۔

میں نے اپنی بات دہرائی تو وہ ایک چٹ اور پسل سنبھال کر بوسے۔
 ”شاہی صاحب نے آپ کو بلایا تھا کیا؟“

”جی“

”آپ کا شبہ نام؟“

”مالا“

پچھراسی کو چٹ دے کر انہوں نے ڈھیلے ڈھالے ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گئی، سینگر کے کہیں کی چھت اور دیواروں پر ٹیک وڈ لگی تھی۔ فرش پر دبیز بندہ بچا تھا۔۔۔۔۔ امیر کنڈ شینگ کی وجہ سے فضا تنگ تھی میں خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگی۔ اور پپ پاپ نوجوان منیجر کو دیکھتی رہی۔ جو میری فائل کے کانڈوں کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ وہ مجھ سے کئی سوال کر چکا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر بوسیت کے آثار نظر آنے لگے۔ اور پھر اس نے فائل کو اتنی قطعیت کے ساتھ بند کر دیا جیسے کہیں آئندہ اسے کھولنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ جب اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے یہ نوکری ہرگز نہ مل سکے گی۔ سوچنے لگی کہ مرد جب کسی عورت کو ملازمت دینا چاہتا ہے تو اس کی شکل و صورت کو مزید پرکھتا ہے۔ چاہے دعا کچھ بھی نہ ہو۔ میں پریشان نہیں تھی۔ قبول صورت تھی۔ علاوہ ازیں مجھے پڑوں کے رنگوں کے میچ ملائے اور انہیں پہننے کا سلیقہ بھی تھا۔ میرے دل میں بے

تکلفی نہیں تھی۔ اور نہ میں دم بازی۔۔۔۔۔ FLIRTATION پسند کرتی تھی، آخر تو میں شادی شدہ عورت تھی، شوہر کی آمدن سے اخراجات تو پورے ہو جاتے تھے۔ لیکن نئے زمانے کی ضرورتیں استغناء بڑھ گئی ہیں کہ میرے لیے نوکری کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

ساجی صاحب نے اڈے ہوئے انداز میں کہنا شروع کیا:
 ”تو آپ کی شادی ہو چکی ہے؟“
 ”جی“

”وہ بچے بھی ہیں؟“
 ”جی وہ دونوں اسکول چلنے لگے ہیں۔“

کیسے بے نیچے سوالات تھے! مطلب تو یہ تھا کہ میں رفتاری کام کو اچھی طرح نہاہ سکوں، مجھ ان سوالوں کے کیا ماحصل؟

ساجی صاحب فائل میری طرف بڑھا چکے تھے، مینے بھی ان کی زبان سے انکار سننے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا، دل کو اس بات کا رکھ بھی تھا کیونکہ عازمت حاصل کرنا، میرے لیے بے حد ضروری تھا۔

ساجی صاحب مجھ سے کم از کم تھیں سال چھوٹے تھے۔ مشکل سے چوبیس سال کے، باپ کا ذاتی کاروبار تھا، اس لیے مینیجر بنے بیٹھے تھے، ورنہ کمیشن کے اس زمانے میں نوکری تلاش کرنا پڑتی تو آٹے وال کا بھاد معلوم ہو جاتا، مجھے موسس ہو کر انہیں میرا نام ملے پسند نہ تھا، مگر میں کشش بھی کیا ہے! شاید وہ سوچ رہے تھے، کہ مجھے کورا جواب دینے کے لیے کون سے الفاظ مناسب رہیں گے۔

معا انہیں کسی بات کا خیال آیا بولے: "آپ کچھ ہی دیر پہلے اس لمبی سی
مریڈینہ کار میں سے اتری تھیں نا؟"
"جی ہاں۔"

"اتفاق سے اس وقت میں برآمدے میں کھڑا باہر کی طرف جھانک رہا تھا۔"
"ادو!"

انہوں نے قدرِ تجسس سے اپنے ہاتھوں کو ملتے ج ملتے پھر دریافت کیا۔
"گنگرہائے بالوں والی وہ لڑکی جو کار چور ہے تھی، کون تھی؟"
"لحہ بھر کو میں متذبذب میں پڑ گئی، لیکن انہیں اسقدر متجسس پا کر میں نے
بولب دیا۔" وہ میری بہن تھی..... کزن! یہی میرے پاپا کی لڑکی۔"
"ساکھی صاحب کا بچہ ہر شگفتہ ہو گیا، بولے۔" دور سے تو وہ کافی حسین لگ
رہی تھیں۔"

"جی! نزدیک سے دیکھنے پر بھی وہ بید حسین دکھائی دیتی ہے۔"
اب میں نے اپنی قاتل واپس لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو انہوں
نے فوراً ہی اس پر اپنا پنجہ رکھ دیا اور بولے: "آپ ایسا کیجیے کہ کل سے اپنے
کاہ پر آجائیے۔"

گنتی

ستائیس اگست کا ذکر ہے۔ میں چنڈی گڑھ کے سوزگارڈن میں بیٹھی
تھی، قریب پکپک تھیں فٹ پرے ایک چھوٹی سی دکان سے فربج میں رکھی

ٹھنڈا اور میٹھی سی دالا پڑسنگ کا لٹاف لے کر میں نے اس جگہ اخبار کا ایک ٹھنڈا
 گھاس پہ بچھایا اور اس پر بیٹھ گئی۔ دوکان کے دوکر نے پہلے سے ہی لٹاف کا کوٹا
 بیڈ سے کاٹ کر ایک اسٹرا STRAW سیس ڈال دیا تھا، ٹھنڈی سی دھیرے
 دھیرے چکنے میں ڈال رہا تھا۔ دل کو فرحت حاصل ہو رہی تھی۔ اور آنکھوں
 کو ملاوت۔ میری نظر کسل منانہ انداز سے پورے باغ کا جائزہ لے رہی تھی۔
 زمین کا یہ قطعہ ہوا نہیں، بلکہ اوپر کھائے تھا۔ اسی لیے اس میں قدرتی حسن کی
 جگہ نظر آتی تھی۔ گلاب کے پھول تو تھے ہی، لیکن ہری بھری گھاس اور جھاڑیوں
 نما پڑ لگ بھار دکھار ہے تھے۔ پیڑوں کے اس پار فوارے کی اگھوٹی دھار جو ہم
 گویا آسمان کو چھونے کی امکان بھر کو بخش کرتی۔ اور پھر سرنگوں، ہوکر تالاب کے
 پانی میں جا گرتی، جس جگہ کہیں بیٹھتی تھی وہاں سے پانی کی مٹھ کاٹاں ہی نظر آتی
 تھیں۔

اس طرح گھومتی ہوئی میری نظر پھر سس والی دوکان پر جا پہنچی۔ اور وہیں
 رک کر رہ گئی، سبب؟

میں بہت علیل تھی۔ یہ میرا حسن ظن نہیں تھا اور ذہنی آئینے کے ہکاؤ
 کا شکار تھی۔ یہ تو خلقِ خدا کا زمانہ تھا۔ چنانچہ مجھے درابھی تعجب نہ ہوتا جب
 میں دیکھتی کہ مردِ خصوصاً نوجوان میرے ایک آرمہ جلوے پہ دل تمام کر رہ جاتے
 مگر اس وقت میں ایک عورت کو اپنی طرف ماحشادہ نظر سے متوجہ پا کر
 دم بخود ہو کر رہ گئی۔

خیر! میں نے تجاہلی مارنا نہ سے خود کو از سر نو باغ کے گوناگوں جلوؤں

میں کو دینے کی کوشش کی، مگر اس دوران یہ احساس بھی تازہ رہا کہ وہ عورت
مجھے مسلسل گھور رہے جا رہی ہے۔ بے اختیار ہی میری آنکھیں اس کی آنکھوں
سے جا ٹکرائیں، اب تک وہ دیوار سے ٹپک گئے لٹی چمک رہی تھی دوبارہ
نظریں ملنے ہی وہ میری طرف بڑھی۔ قریب پہنچ کر بولی میرا نام پکارا ہے۔
آپ کتنی حسین ہیں! میں تو پہلی نظر میں ہی آپ کو دل سے بیٹھی۔ کیا میں آپ
کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟

اپنے سوال کے جواب کا انتظار کرتے بغیر اس نے میرے ہی اہلکامدرا
دق گھاس پڑھچایا اور سپر کر بیٹھتے ہوئے بولی، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میرا
آپ سے شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ کیوں کہ میری شادی ہو چکی ہے۔
شوہر صاحب مجھ پر مہربان ہیں، اور میں دو بچوں کی ماں بھی ہوں۔
مجھے بے اختیار ہی جہنی آگئی، بولی، اگر آپ خرد ہو تیں تو یقیناً آپ
سے شادی کر لیتی، کیونکہ آپ میں کچھ کم حسین نہیں ہیں۔

ارے جگنو! کا نام لیجیے، بجلا میں کہاں کی حسین ہوں! آپ مجھے زیادہ
حسنیٰ قبول صدمت یا گوارہ کہہ سکتی ہیں۔ یوں تو سیدھی سادھی صدمت کے کچھ
خاندے بھی ہیں، مثلاً ہر ایما نیزا کا عشق کا دم نہیں بھرنے لگتا، مردوں میں
ایک بہت بڑی کمی یہ ہے کہ وہ اپنی صدمت تو آئینے میں دیکھتے نہیں البتہ
صیتوں پر جان نہجا اور کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ کیسہ میں بھوٹھ بولیا؟
اس نے آخری الفاظ غصہ بنگالی لہجہ میں اس انداز سے ادا کیے کہ بس لطف
آگیا۔ میں نے بھی ذرا کہا، "دش بھوٹھ بولیا، دتساں کھر تو لیا۔"

ہم دونوں کھٹکھٹا کر نہیں دیں۔ تب وہ بے تکلفی سے بول "دل کے بدلنے کو جو بھی کہہ لیں، کیجیے میں یا کون عورت ایسی ہوگی جو آپ کی طرح حسین ہونے کی تمنا نہ کرے؟ حسن تو بھگوان کی دین ہے۔ اگر یہ حاصل نہ ہو تو کیا آپ جیسے من والوں کی دہلیز پر سجدہ بھی نہ کریں؟ آپ کا قرب حاصل کر کے آپ کے جلوؤں سے محفوظ بھی نہ ہوں؟۔۔۔۔۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟"

یہ تھی ہماری پہلی ملاقات، کچھ ہی دنوں میں ہم دونوں کی دوستی بہت گہری ہو گئی، ہم ایک دوسرے کے لیے "آپ سے" تم "ہو گئیں۔" نو نوکری کرتی تھی، دفتر سے فرصت پا کر اس کا زیادہ تر وقت شوہر اور بچوں کی دیکھ بھال میں گزارتا تھا، پھر بھی ہر تیسرے چوتھے دن ہماری ملاقات ہو جاتی تھی۔ کبھی باغ میں، کبھی بھیل کے کنارے اور کبھی بازار میں، اکثر اس کے شوہر صاحب اور بچے بھی اس کے ساتھ ہوتے تھے۔

مہینہ بھر کے اندر ہی ہماری اتنی گاڑھی بچھتے لگی جیسے ہماری دوستی پرانا پرانا ہو۔

ایک روز میں نے اس سے کہا "ملا دیو! ختم ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی ہو، چاہے دفتر میں چاہے گھر پر، میرے خیال میں تمہیں کبھی کبھی گھر والوں سے الگ بھی کچھ وقت گزارنا چاہیے۔"

میری بات سن کر ملا بولی "میں تم سے متفق ہوں۔ یہ خیال تو کئی بار میرے دل میں بھی آیا لیکن کوئی ساتھ دینے والا نہیں تھا۔ اچھا! اب کسی روز ہم دونوں ہی پبلک کا پروگرام بنائیں گے۔"

اچھے کچے ہی دلوں لہہ ایک دوز مالا نے مجھ سے کہا "لو بھیجی! کل ہم دوزوں
 پنجرہ گارڈن میں پنک مٹانے چلیں گی۔ اپنے گھر سے کچے کھانے کا سامان لے آنا،
 اور میں بھی کچے لیتی آؤں گی۔ صبح دس بجے کی بس سے ہم پنجرہ گارڈن کو روانہ ہو
 جائیں گی۔ چار یا پانچ بجے تک لوٹ آئیں گی، بولو منظور ہے؟"

"بالکل منظور ہے۔"

دوسرے دن ہم سیکٹر نمبر ۱ کے بس اڈے پر پہنچ گئیں، اطمینان سے
 بس میں بیٹھ کر ہم ادھر ادھر کی گپ بات کرتی رہیں۔ وقت گزرنے کا کچھ پتہ ہی نہیں
 چلا۔ راستے میں میں نے پوچھا "تمہاری خیر عافری میں تمہارے بچے تیار ہو اور بچے
 کیا کریں گے؟"

مالابول: "بچوں کو تو میں "نان کن" کے پاس چھوڑ آتی ہوں۔ وہاں وہ
 سارا دن بہت خوش رہیں گے۔ اپنے تپ دیوا..... تو ان سے میں نے کہا
 دیا تھا کہ آج وہ کسی بوتل میں ہی سبجو جن کر لیں۔"

"تو گویا کسی قسم کا جھنجھٹ نہیں ہوا۔"

"بالکل نہیں۔"

پنجرہ گارڈن پہنچ کر بس رکی تو ہم کھانے والے سامان کے تھیلے کندھوں
 پر لٹکاتے اسکوئی دیکھوں کی طرح چبکتی ہوتی میچے اتریں۔ گیٹ میں گھسنے کے
 لیے ٹھکٹ خریدیں۔

اس باغ کی کئی منزلیں ہیں۔ ہم دوسری منزل پر پہنچ کر بیٹھنے کے لیے
 کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگیں۔ آخر پیڑ کے نیچے مدی بسچا کر ڈیزہ لگا

دیا اور تاش نکال کر پہنچا کھینچنے لگیں۔

آبا اکتا لطف آ رہا تھا اس وقت ملا بھی خوب چہچہا رہی تھی۔
کچھ گیم Game ہو چکے تو پتے ہانٹتے ہانٹتے ملا کے ہاتھ رک گئے اور
وہ ایک سمت کو مٹکی ہانڈ کر دیکھنے لگی۔ کہیں نے پوچھا۔
”کیا بات ہے؟“

مالا نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سرگوشی میں جواب دیا۔ ”میرے
باس سے آ رہے ہیں، ان کو سب ساہی صاحب کہتے ہیں، زحمت
کیسے اٹھانے پر پر گئی ہے۔“

میں نے بھی سر کر دیکھا تو ایک بلند بالا حسین نوجوان نظر آیا جو دور ہی
سے مسکراتا چلا آ رہا تھا۔

مالا نے چہرہ سرگوشی میں کہا۔ ”بانت مانا گئی ایہ اتفاق سے اور آچکے ہیں
میرے پاس ہیں، ان کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں ہو گا۔“

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ ایسا اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔“
اسی اثنا میں ساہی صاحب ہمارے کافی نزدیک پہنچ گئے، ہنستے
ہوئے بولے۔ ”ہیلو! مالا جی۔“

”ہیلو! سزا۔“

وہ چہرہ بولے۔ ”میں کبھی کبھار سیر کے لیے یہاں بھی آ سکتا ہوں۔ کوئی
نہ کوئی دوست بھی مل جاتا ہے اور وقت اچھی طرح کٹ جاتا ہے۔ یہ قسمی
سے آج مجھے ایک بھی دوست دکھائی نہیں دیا، بہت بور ہو رہا تھا کہ اچانک

ہی آپ پر نظر پڑی اور میں ادھر چلا آیا۔
 ”جو آرموسٹ و لیکم

آئیے نا! آپ بھی بیٹھ جائیے۔“

ابھی تک صاحب میری طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے، مجھ پر نظر پڑی تو ہلکے پکارتے ہوئے مالا سے کہنے لگے ”نہیں میرا بیٹا مناسب نہیں ہوگا، صاف کیچھی ہے معلوم نہیں تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے حد نہ میں آپ کو برگزڈ سٹرب DISBUR ذکر تار۔“

مالا نے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر صاحب سے مخاطب ہو کر بول ”کوئی ہرج نہیں، یہ بھی کوئی غیر نہیں ہیں، میری چھوٹی بہن ہے..... میرا مطلب کرنل اخلاص سے ہے، یہ میرے دوسرے انکل کی بیٹی ہے۔“ صاحب نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے نصیحت کی، میں نے بھی جواب میں ہاتھ جوڑ دیئے۔

ایک بار صاحب نے رخصت ہونے لگنے میں اپنے اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے ”آپ سے بھی ملنا چاہتا ہوں، میں نے خواہ مخواہ رنگ میں بھنگ ڈال دی۔“

ان کے بولنے کا انداز اتنا مہذب تھا اور دیکھتے میں وہ اتنے محین تھے کہ بے اختیار ہی میرے منہ سے نکل گیا: ”آپ میری دہ سے پریشان نہ ہوں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہے تو آپ بڑی خوشی سے تشریف رکھیے۔“

میری بہت سن کر مالکوا ملتان ہوا، بولی، ہاں، ساہی صاحب! آپ
 ہمارے پاس ہی تشریف رکھیے تاہم پلیو کھیل رہے ہیں، آپ بھی شامل
 ہو جائیے۔

اس کے بعد ہم نے پچھلے کھک کر ساہی صاحب کے بیٹھنے کے لیے دری
 پر جگہ چھوڑ دی، مگر ساہی صاحب نے جیب میں سے بڑا سا مال نکالا اور
 اسے گلاس پر بچھاتے ہوئے بولے: چٹا کھجور کھجیے! میں یہیں پر بیٹھ
 جاؤں گا:

وہ بیٹھ گئے تو ملا کھنے لگی، ارے صفت کیجئے گا، میں آپ دونوں
 کا باتامدہ تمارت کرنا تو بھول ہی گئی، اب تو ساہی صاحب! یہ میری
 کزن ہے۔ نام گنی ہے جی، این، اسی کہ کچی ہے اد اب ڈاکٹر سی کا
 کورس کرنے کی تیاری میں ہے۔

ساہی صاحب نے پھر بے تھوڑ کر میری طرف دیکھا اور بولے: آپ
 سے بل کر بہت خوشی ہوئی۔

تب آنے ڈھیلے ڈھالے ہاتھ سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
 مجھ سے کہا، بھی گنی! یہی میرے پاس ہیں جن کے بارے میں تمہیں پہلے
 بھی بہت کچھ بتا چکی ہوں۔

میاں پر ملا بھوٹ بول گئی کہ بھول کر اس روز سے پہلے ساہی صاحب
 کے بارے میں اس نے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

خیر! ساہی صاحب ہمارے کھیل میں شامل ہو گئے، خوب مزے

کا گیم ۶ (GAME) جاکھیل کے دوران باتوں کی پھلکھڑیاں بھی چھوٹتی رہیں ،
 وقت کافی گزر گیا تو لالہ نے سناش کے پتے ذری پر پچھتے ہوئے کہا ہنس
 کھیل ختم۔ مجھے تو بڑی نعد کی جھوک لگی ہے ۔

اب ساہی صاحب نے رخصت چاہی لیکن ہم دونوں نے بڑے امرار سے
 ابھیں بٹائے رکھا اور کہا کہ یارے ساتھ کھانا بھی کھائیے کیوں کہ ہمارے پاس
 کافی کھانا موجود ہے ۔

مخوڑا ساہی صاحب چھوڑ پیٹ گئے ۔ بھجن کا مزا بھی ختب آیا ، اس دوران
 ساہی صاحب نے ایسے مزیدار چھکے منائے کہ بیتے بننے پیٹ میں بل پڑھ
 گئے میں سوچنے لگی کہ اگر وہ مذاق تو بھلا لطف یقیناً اوصورارہ جائا ،
 کھانا ختم ہو چکا تھا تو ساہی صاحب بولے "لیڈین" اب کافی پلانے کا
 لمبازت مجھے ملنی چاہیے ۔

"امدات ہے" مالا جٹ سے بول اٹھی ۔

ساہی صاحب ہیں اس چوڑے پر نے گئے ، جس کے دائیں بائیں ڈر
 پھوٹے ہوئے تھے ، اور جہاں ایک چھوٹی مس کمان بھی تھی ، ہم بید کی کرسیوں
 پر بیٹھ گئے ، فواروں سے اڑ کر پانی کے جھکے جھینٹے ہمارے چہروں پر گرنے
 لگے تو کافی پیسے کا لطف دو بالا ہو گیا ۔

واں بھی ہم بہت دیر تک بیٹھے رہے جب چار بجے تو مالا بولی "اب
 واپس پلنا چاہیے"۔

ہم تینوں بانٹے سے باہر آ گئے تو مالا نے ساہی صاحب سے رخصت چاہی

اس پر وہ کہنے لگے کہ بس پریشانی کی ضرورت تھی جب کہ ان کی ذاتی کارروائی موجود تھی۔

ان کی ایمپرویڈر (employee) کار میں واپس موٹنے کا آگاہی ملنے پر وہ اتنے بیس کنج تھے کہ راستے میں کوئی نہ کوئی سینی منڈائی کی بات کہتے رہے، پہلے وہ بارے ہی بنگلے کے آگے رُکے، نیچے اتر کر میں نے کچھ دیر کیلئے اندر آنے کو کہا، لیکن وہ بے کہ پھر کبھی نہیں گئے۔

جب میں اپنے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی تو میرے کانوں میں ساہی صاحب کی آواز سنائی دی، "مالا جی، آپ گلہ کرنا ایک سے ایک بڑھ کر حسین ہے۔"

میجر آسنہ

محلایک کے پھولوں کا شہر میں شاید ہونے والا تھا، میں دانتوں میں پائپ دبلے اپنے بنگلے کے سامنے والے لان پر آرام کر رہی تھی، دھنسا اس موضوع پر اپنے مامی سے بات چیت کر رہا تھا، ہمارے گنگو ہو چکی تو مالی ماں سے چل دیا، تب میری نظر اس خاتون پر پڑی جو شاید کچھ دیر سے وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی مجھے دونوں ہاتھ جوڑ کر فستے کا جواب دیدیا تو وہ چند قدم بڑھ کر میرے پاس پہنچ گئی، میں نے بیٹھنے کے لیے ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا تو اس نے بیٹھتے ہی پوچھا،

”آپ گنی کے ٹیڈی ہیں نا؟“

۔ جی ہاں، لیکن گنی اس وقت جگہ میں موجود نہیں ہے۔
 کوئی ہرج نہیں۔ میں حاصل آپ ہی سے ملاقات کے لیے حاضر
 ہوئی ہوں۔

یہ سن کر مجھے قدرے تعجب ہوا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے ساٹھ
 سالہ بوڑھے سے کیسے جوان اور قبول صحت خاتون کو کیا کام ہو سکتا ہے،
 میں نے کہا: فرمائیے؟

لحمہ بھر کو وہ ہیکچا پٹی اور پھر کہنے لگی: میں شادی کے سلسلہ میں آپ سے
 بات کرنے آئی ہوں۔

میں چونکا ہوا اور منہ سے پانیپ کی ٹیپڈی باہر نکال کر جواب دیا: یہ
 آپ کیا کہہ رہی ہیں! بسط اس عمر میں شادی کروں گا کیا؟
 میں آپ کی نہیں، گنی کی شادی کی بات کرنے آئی ہوں۔

میں قدرے جھینپ کر بولا: اوہ! فرمائیے، آپ جانتی ہیں ہوں گی کہ
 ہر باپ کو اپنی جوان لڑکی کی شادی کا کتنا خیال ہوتا ہے۔

اب آپ کو اس سلسلہ میں کچھ بھی چننا کرنے کی ضرورت نہیں ہے میری
 نظر میں ایک لڑکا ہے اُس کا نام ونور سا ہی ہے، بہت بڑی فرم کا لہک
 ہے، اور نچا لمبا حسین جوان ہے، تسلیم یا نہ ہے اور روپے پیسے کی بھی کوئی کمی
 نہیں ہے۔

میں نے کہا: ... کیا کہئے! آپ نے آنے میں دیر کر دی،
 یہ سنتے ہی اس کا چہرہ اتر گیا اور وہ بے اختیار بولنے لگی: مائی گاڑا تو

گویا آپ نے گنئی کارشتہ پہلے ہی سے طے کر دیا ہے۔
 • بی ان۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس نوجوان سے میری بیٹی کا رشتہ
 کیوں کر لانا چاہتی ہیں؟

• اب کیا بتاؤں! دراصل جیسا کہ میں نے پہلے پہل سنا ہی صاحب کے یہاں
 نوکری کے سلسلہ میں گئی تھی۔ اس روز مسٹر ساہی نے مجھے اس کار میں سے
 اترتے دیکھ لیا جس کی لفٹ نے کمرے میں اُن کے اُن پہنچتی تھی، کار کو چلانے والی
 ایک حسین لڑکی تھی میرا انٹرویو تو نا کامیاب رہا اور ملازمت ملنے کی کوئی امید
 نہیں تھی، تب ایک ایک مسٹر ساہی نے مجھے سے دریافت کیا کہ جیسا کہ میں
 سے میں اُسی تھی، اس کی ماکن لڑکی کون تھی، دراصل میں اس لڑکی
 کو بالکل نہیں جانتی تھی، محض اس کی کار میں لفٹ کے کردار تک پہنچتی تھی
 مگر میں نے محسوس کیا کہ مسٹر ساہی کو اس لڑکی سے گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔
 سوچا کہ اگر میں نے سچ بتا دیا کہ وہ لڑکی میرے لیے بالکل اجنبی تھی، تو
 ساہی صاحب کی دلچسپی ختم ہو جائے گی چنانچہ میں نے فوراً کہہ دیا کہ وہ لڑکی
 میری بہن ہے، یعنی کزن۔۔۔ میرے اہل کی بیٹی۔ اب مسٹر ساہی کا چہرہ مکمل
 اٹھا بے نوکری ہو گئی، اس کے بعد ساہی صاحب نے کئی بار اس لڑکی سے
 ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، یہ بات میرے لیے ناممکن تھی، میں کسی نہ کسی جیل
 سے ملتی رہی، تو عاہر تھا کہ صاحب اس لڑکی سے ملنے پتے جوئے
 تھے ایک دن کارڈن میں اتفاق سے میری تلگونی پر پڑی، اُس کا تاجناک
 حسن دیکھ کر مجھے ایک ترکیب سوچی، میں نے گنئی سے دوستی کاٹھ لے لی، بعد

میں اس کی ملاقات بخیر کارڈن میں مسٹر سائی سے کرا دی گئی کار والی
 لڑکی سے کہیں زیادہ حسین تھی نتیجہ ہوا کہ سائی صاحب کو پہلی لڑکی بھول
 گئی اور وہ گنتی بے عبت کا دم بھرنے لگے۔ گنتی کریم ان سے پایہ ہو گیا رہا
 تک کہ وہ شادی پر آمادہ ہو گئی۔ اس لیے میں اپنی دانت میں آپ کے پاس
 پہلے ہی سے حاضر ہو گئی تاکہ اگر مسٹر سائی اس سلسلہ میں آپ کے پاس آئیں
 تو آپ بغیر سوچے سمجھے انکار نہ کر دیں، مگر بد قسمتی سے آپ نے پہلے ہی گنتی
 کا رشتہ طے کر دیا۔ میرے لیے پھر سے عبت کھڑی ہو جائے گی کیونکہ مسٹر
 سائی کار والی لڑکی کے بارے میں مجھ سے پوچھتا چھ کرنے نہیں گئے اور ملاقات
 پر حاضر بھی کریں گے۔ سہاش! آپ نے میرے آنے سے پہلے یہ رشتہ طے نہ
 کیا ہوتا۔

میں نے اپنی مونچھوں تلے سکراتے ہوئے کہا: آپ کو کمزور ہونے کی
 کوئی معرفت نہیں ہے، ورنہ سائی آپ کے یہاں آنے سے پہلے ہی میرے
 پاس پہنچ گیا تھا۔ لڑکا ابھی بہت پسند آیا، چنانچہ میں نے یہ رشتہ منظور
 کر لیا۔

اے سن کہ اس خاتون کی خوشی کا شکا نہ نہ رہا۔ میں نے پھر کہا: آپ نے
 (پناہ) تو بتایا ہی نہیں۔

• ملا! میری شادی ہو چکی ہے اور دو بچے بھی ہیں۔

اب وہ جانے کے لیے اسٹریٹ ہی تھی کہ گنتی آپ کو پہنچی۔ دونوں سہیلیاں
 بڑے تپاک سے ملیں۔ گنتی سے ملا کر رو کر پالیا، لیکن وہ بولی: پھر کہیں آؤں

گی، ابھی بہت جلدی میں ہوں۔
 اس کے بعد ملانے میری جانب دیکھ کر کہا، اس رشتہ کے لیے
 آپ کا بہت بہت شکریہ!
 یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئی۔

گننی نے حیرت سے کہا، ٹیڈی! یہ بڑی عجیب لڑکی ہے، مبارک باد
 دینے کے بجائے شکریہ ادا کر رہی ہے، یہ بات اپنے توپے جیسے پڑی۔
 میں چپ چاپ سکرتا رہا، گننی نے مجھے مسکراتے دیکھا تو چڑھ کر بولی،
 "ٹیڈی، آپ بھی عجیب آدمی ہیں آپ ہی بتائیے کہ مبارک باد کہنے کا موقع
 کتنا کہ شکریہ ادا کرتے ہیں؟"

میرے خیال میں تو شکریہ ہی ادا کرنا چاہیے تھا۔
 اس پر گننی بھڑک اٹھی، بولی اس میں تو آپ دونوں کی سبزش معلوم
 ہوتی ہے، آخر آپ ملا کو کب سے جانتے ہیں؟

"بیس بیس پچیس سال ہوئے جب ہمدی پہلی ملاقات ہوئی۔
 آٹ! میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، پاگل ہونے کی کوئی عزت
 نہیں ہے، تم جا کر خانہ سال سے کہو کہ وہ ہم دونوں کے لیے کافی تیار کر کے
 لے آئے، تب میں اطمینان سے تباؤں لگا کر ملانے یہ حرکت کیوں کی۔
 یہ سن کر گننی خانہ سال کو کافی سا ڈر دینے کے لیے کچن کی طرف
 چلی گئی۔

جب تک وہ لوٹ کر نہیں آئی ہیں پائیپ کا دھواں اٹا تاکتا اور
چپ چاپ مسکراتا رہا !! ا۔

پنجاب کا ایبٹلا

یوں تو اس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی، لیکن میں اس قدر ڈیلا پتلا اور مرضی سالر لگا تھا کہ ہر شکل گیارہ بارہ برس کا دکھائی دیتا تھا۔ ان دنوں میں شہر کے ایک اسکول میں نروں چانٹ میں پڑھتا تھا، اصلہڑ میں رہتا تھا، بلور ڈنگ تو برائے نام ہی تھا اسے گھوٹوں کا اصلبل کہنا زیادہ معقول ہوگا، شہر سے باہر ایک کچی سڑک کے کنارے ایک بڑی سی عمارت تھی جس کے ارد گرد کچھ جگہ پھوڑی گئی تھی، عمارت چوکور تھی، اندر گھل سما ایک بہت بڑا قلعہ تھا، جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بارہ سٹارٹش کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھیں اور ان میں سے گد گد نکل کر چلنے والوں کے قدموں کے ساتھ اڑا کرتی تھی، کمرے بہت چھوٹے ہوتے تھے، اور ایک ایک میں کئی کئی لوگ رہتے تھے، ہر رات کے لیے اندری ایک چارپائی، ایک کرسی اور ادھی منہ غصہ میں تھی۔

بلورچی خانے کا کل انتظام لڑکوں کے سپرد تھا، رسولی میں تین ذکر تھے، ایک باورچی اور دو لڑکے، کھانا کھلانے اور دوسرے کاموں کیلئے۔

باورچی خانے میں کوئی شے مول تھوڑے آتی ہے، سب کے سب جاٹوں کے رات تھے گئی اور گیہوں گھروں سے آ جاتے تھے، اور مرضیات

کی آٹھ بیڑیں مثلاً آئینہ من ہنری، شکاری، مددگار سے چال کی جاتی تھی ہوشل کے پیچھے ایک لائیں کے کھیت تھے، اس لائیں کی ایک طرح دار لڑکی اور دو بجیلے جیسے تھے، دن بھر رات کے ہوشل کی پھت پر بیٹھ لڑکی کو آنکھیں مار مار کر اشارے کرتے اور راتوں کو کھیتوں سے تازہ ہنریاں اٹلاتے، پچاسے آرائیں نے ہوشل کے سپرنٹنڈنٹ سے ان راتوں کی شکایتیں کی، لیکن بھلا سوتے ہوئے چہرے والا سپرنٹنڈنٹ اپنی دڑھی کھلا کر رہ جاتا، وہ خود تاجدار تھا لائیں کو تشفی دے کر واپس بھیجتا اور راتوں سے محض زیارتی کام پر مرس کرتا۔۔۔ لیکن راتوں کے محول میں کبھی فرق نہ آیا،

سپرنٹنڈنٹ پکا سیکھ تھا، خوب لمبی لہرائی ہوئی دڑھی، پھول پھلے رنگ کی پگڑی پر اس کا یہ بڑا نیلے رنگ کا حافہ بنگلہ پائٹھار، ڈھیلا ڈھالا کوٹ اس کا اڑاند اس سے کبھی نہیں منبھٹتا تھا، ہمیشہ نیچے لگتا رہتا، ہر روز بلاناغہ گوردوارے باہر پھرتا۔۔۔ وہ راتوں کی اس زیادتی کے سخت خلاف تھا لیکن ہوشل میں اس کی حیثیت بس برائے نام ہی تھی، پچاسے کی بیوی اور بچے ہمیشہ ہمارے تھے، ان کی تیمارداری سے فرصت پاتا تو کبھی کبھار ہوشل میں آجھلتا، رات کے بظاہر اس کا بڑا احترام کرتے تھے لیکن حقیقت میں انہیں اس کی کوئی پروا نہ تھی،

جب وہ ہوشل میں داخل ہوتا تو ٹوٹا بادی خانے کا ایک کوکرا اس کے ساتھ ہوتا برآمدے میں داخل ہوتے ہی وہ رگ جاتا، اونٹا گھٹیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا اس کا منہ اور آنکھیں ہمیشہ سوجھی رستی تھیں اور آنکھوں

سے ہمیشہ پانی بہہ رہا تھا۔ جسے وہ ایک جھاڑن نارول سے گلابے بگاڑے صاف کر لیا کرتا تھا۔ آتے ہی وہ ایک کچی سی جھولی کھانسی کھانتا کہ سب کو اس کی آواز کی خبر ہو جائے۔ سب سے پہلے وہ لوگوں سے گفتگو شروع کرتا، کس سہولی سی بات پر باز پرس ہونے لگتی تھی۔۔۔ کیوں بے شورو؟ پانی یہ تو نئے گرایا لے راستے ہی میں۔۔۔ اور ایں؟ اور کسی نے بھی گرایا، تو نے اسے صاف کیوں نہیں کر دیا جھاڑو سے۔

اتنے میں لڑکوں کو بھی معلوم ہو جاتا کہ حضرت آگے ہیں۔ عموماً سب سے پہلے ہندو لنگھ سب کا چہرہ چھتہ کی طرح مرنے لگتا، حتیٰ کی طرح جھوٹا ہوا آگے بڑھتا اور بڑی تمنا سے اٹھ جھڑکے کہتا: ست سری اکال مل رہی! ست سری اکال۔ پھر پرنٹنٹ کلپ ہلا سوال یہ ہوتا۔۔۔ کیوں سب ٹھیک ٹھیک ہے نا؟

ہندو لنگھ۔۔۔ بڑا اٹھ دھبہ مارنے کے انداز میں اٹھا کر کہتا: سب ٹھیک ٹھیک ہے جی۔

پرنٹنٹ قدم سے سکوت کرتا، اب اس کے بھی جمع ہونے شروع ہو جاتے۔

پرنٹنٹ کے جسم کی بناوٹ بھی عجیب سی تھی، مٹا تو وہ تھا ہی لیکن صدف نہ کرنے کی وجہ سے اوپر کا دھڑا دھڑا لگیں کئی تھیں اور پیٹ خوب پھولا ہوا چنانچہ جب وہ اطمینان کے ساتھ بڑی سنجیدگی صورت بنا کر کوٹ کو پیٹ کے آگے سے بٹاکر دونوں اٹھوں کو کوٹھوں پر رکھ کر کھڑا ہوتا تو اس کا چھوٹا ہوا پیٹ

اور بھی اگے کر دیا جائے۔ اور وہ کسی سپرے کی بین کی طرح نظر آنے لگتا۔ اسے
 دیکھ کر لوگوں کو شینس آ جاتی۔ سپر ٹنڈنٹ دل میں سمجھتا تھا کہ لڑکے اسی پر
 شینس رہے ہیں، چنانچہ وہ مقبول ہونے کی غرض سے نوابے تکلف ہو
 کر بناوٹی غصہ سے پوچھتا: "بنداد گلہ تم بڑے شیطان ہو گئے ہو؟"
 "ہی میں؟" بنداد گلہ اپنی موٹی سی انگلی اپنے سینہ پر رکھ کر حیرت کا اظہار
 کرتے ہوئے کہتا: "باگورو۔۔۔ میں تو آپ کا داس ہوں جی، کہئے تو اب میں سزا
 کر رکھوں، قبول میں۔"

اس بات پر لڑکے خوب قہقہے لگا کر ہنستے، کوئی لڑکا کسی کی اوٹ میں ہو
 کر کہتا کس کا سر؟

اب بنداد گلہ نمتھے چھلکا کر مارتا: "اوسے اوسے۔۔۔" پوچھو دار جی کھڑے
 ہیں دھنہ ابھی تیرا سورنا دیتا پکڑ کر۔
 اس کے بعد سپر ٹنڈنٹ اسی طرح باتیں کرتا ہوا سارے ہسٹل میں سڑکی
 طرح گھوم جاتا، اور باہر نکلنے سے پہلے ایک مرتبہ لڑکوں کو تنبیہ کے طور پر کہتا
 اچھا اب بڑی بات سے آتی ہے نا:

"جی ہاں۔۔۔ اب تو ہم روز کا حساب بھی کھہ کر دیتے ہیں، دیکھیے گا؟"
 وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں، لیکن وہ اس بات
 پر مطمئن تھا کہ کم از کم اس کی عزت تو رکھ لیتے ہیں، وہ اسی بات پر اپنی غیر ملتا
 حساب وغیرہ دیکھے بغیر اچھا اچھا کہتا ہوا چلا جاتا۔

اس کے جلنے کے بعد لڑکا سنگھ پانی کے گلاس میں بے پند ہونڈیں

کدس سے باندھ دی پچیس میل کا سفر تھا۔ پپ سولیوشن دہڑ دھڑھ مڑوری
 سامان چڑے کے چھوٹے تھیلے میں رکھ لیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ستوڑی
 دیر آرام کیا اور دھوپ کی تمازت نسبتاً گرم ہونے تو چل دیا۔
 اس وقت پانچ بجے تھے۔ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے میں
 گاؤں پہنچ جاؤں گا۔

جیسے شہرے باہر نکل آیا تو ایک کھار کی دکان پر کن پڑا میں شام کو جب کہیں اور
 سے گزرتا تھا تو میری آنکھیں کسی کی تلاش میں اس دکان کی طرف اٹھ جاتی تھیں کھار
 کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا سن اگر پچیس سے کم نہ تھا لیکن متقی بڑی
 طرح لڑ۔ اور پھر اس کی چہرہ وہ سالہ لڑکی کے کیا کہنے، میں شرمیلا اور خاموش
 مزور تھا۔ لیکن بچپن ہی سے ایک سخن پرست طبیعت اور عاشقانہ مزاج رکھتا
 تھا۔ کھار کی بیٹی کو دیکھ کر مجھے سوہنی کا خیال آ جاتا تھا۔ سوہنی بھی کھار کی تھی۔ وہ
 لوگ اس قسم کے قصوں کو بار بار نہیں کرتے۔ اور انہیں ڈھکھو سفلوں سے زیادہ
 اہمیت نہیں دیتے لیکن میری نظروں کے سامنے یہ ذہرہ جہیں رکی تھی۔ اس پر
 کوئی بڑے سے بڑا شہزادہ بھی عاشق ہو سکتا تھا۔ میرا عشق کس قدر بے بس
 اور اپنے آپ ہی میں سگنے والا تھا۔ نہ میری شکل اچھی تھی نہ جسم مہینڈی وال جب
 سوہنی کھار کی دکان پر گیا تھا تو اس نے ساری کی ساری دکان ہی خرید
 ڈالی تھی۔ لیکن میں دکان تو کیا خرید کرتا۔ بس اس کی صورت دیکھنے کے لئے
 وہاں چلا جاتا۔ کہیں مٹھی کا دبایا ایک پیالہ یا مرئی خرید لیتا اس کی ماں پر سے
 کھٹا پر مٹھی رہتی تھی۔ مجھے مطلوبہ برتن اٹھا اٹھا کر دکھاتی۔ اس کی ماں

مجھے تاباں بچھ کر اس طرف زیادہ توجہ نہ کرتی تھی۔ ادھر میں جی بھر کر اس
تمغی سرسہنی کو دیکھا کرتا۔ وہ بھی المڑھی سی تھی۔ اُسے کہیں میری آنکھوں میں
کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ وہ سر دھری سے میری طرف دیکھتی۔ اچھا
یہ پیالہ تمہیں پسند نہیں۔۔۔ کیا خرابی ہے۔ اس میں۔۔۔ اچھا یہ نہ۔۔۔

میں مرعوب ہو کر کہتا: نہیں نہیں اگر تم کہتی ہو تو میں یہی خرید لیتا ہوں
وہاں سے برتن لاکر میں ہوسٹل کی پھیل دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیتا اور
دل شکستگی کے عالم میں ہوسٹل کے اندر داخل ہو جاتا تو ادھم گنگھ میرا منہ
لٹکا ہوا دیکھ کر بکا کر کہتا: سنا بائی بھری سنبھار۔

اس دن جب میں ان کی دکان کے سامنے رکا تو اس وقت اس تو غالباً
گرمی کے مارے مکان کے اندر گھس بیٹھی تھی۔ البتہ لڑکی سر پر کپڑے کا ایک
مکڑا اڈالے ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ اس کا چہرہ گرمی سے تتلیا ہوا تھا مکمل۔
خوب سرخ ہو رہے تھے میں اس کے قریب جا بکھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف
دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں اُن پھنسا گیا یہ کھن تھا کہ وہ مجھے کبھی اپنے
گال چومنے کی اجازت دے دے۔۔۔ کیا چاہیے اس نے پیٹھ موڑ کر
کوئی برتن ہلاتے ہوئے کہا۔ میں نے کوئی اچھی مراحمی طلب کی۔ اس نے
ملکین سٹی کی بھی ہوئی مراحمی میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: یہ لے جاؤ پانی
ایسا ٹھنڈا ہوا کرے گا کہ لیں یاد کرو گے عمر بھر۔

عمر بھر یاد کرنے والی بات تو اس نے نصف دکانداری کے خیال سے کہہ
دی تھی۔ لیکن میرا دل چھاتی کے قفس میں سے نکل کر اس کے قدموں پر پکھلا

کہ وہ جے ہول کھیتوں کی پگ ڈٹیاں تھنپوں کی طرح ایک دوسرے کو کاٹتی
 ہوئی دوڑنے لگی تھیں دورانہ میں کوئی شخص گھوڑے پر سوار اسے سرپٹ
 دوڑا سے چلا جا رہا تھا اس قدر حیران اور رونا سے جیسے نہ تو اس کا گھوڑا کبھی ٹھکے
 گا اور نہ زمین ہی کہیں پر ختم ہوگی بس اس کا تھکیا اور برق رفتاری سے ابد
 تک دوڑتا چلا جائے گا اور وہ خود اس جوش و خروش سے رہتی دنیا تک
 اس پر بیٹھا رہے گا، بلند پرواز پرندوں کی ٹکڑیاں آسمان کی طرف پرواز کرتی
 چلی گئیں یہاں تک کہ پرندے پھوٹے پھوٹے نقطوں کی طرح نظر آنے لگے،
 آسمان کی وسعت بے کارت تھی، اور پرندوں کی طاقت پر واز پے انداز ہوا کے
 بھونکے چلنے لگے اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں آگے ہوئے پورے
 ایک رخ کو سر بہ بخود ہوئے جاتے تھے جیسے کوئی ازلی نعمت سن کر وہ ایک ساتھ
 سر و جن رہے ہولہ دراصل وہ شاید قدرت کی ایک صلاح تھی جسے سن کر سوانے
 متہ ودر گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا، پرندے تیر کی سی تیری کے ساتھ آسمان
 کی دستوں میں پرواز کر گئے اور کھیتوں میں پورے دھڑپیں آکر بھونکتے لگے،
 موسم خوشگوار تھا، میں نے روں روں کرتے ہوئے رہٹ کے قریب
 سائیکل روک لی، نہانے کو جی چاہ رہا تھا، چنانچہ میں کپڑے اتار کر ادلیوں
 میں باگھسا، بیلوں کی آنکھوں پر کھوپے بندھے ہوئے تھے وہ سر ہلاتے اور
 مڑے سے بھاگ اڑاتے تیز تیز قدم اٹھاتے گئے، رہٹ گیت گانے لگا اور
 پانی اس تیزی سے باہر گرا تھا، جیسے کنوئیں میں پڑے سہارے اس کا دم
 گھٹ گیا ہو، اور پانی میرے بھلے ہوئے جسم پر گرا تو میں نے ایک آسمانی

فزعت محسوس کی اور سنبھل کر جہاں کے نیچے ہی بیٹھ گیا۔ پانی مل کی طرف باریک چادر
 میں سے آسمان، زمین، درخت پودے، کلیں کرتے ہوئے بھڑکے، تلاء باڑیاں
 لگاتے ہوئے مینڈک سب میری مسرت میں برابر کا حصہ لے رہے تھے،
 میں بہت دیر تک نہا تا رہا۔ بڑی بڑی مونسچوں والا کسان، جس
 کی ڈھیل ڈھالی گچڑی میں سے کانوں کے پیچھے پکھنے پٹے نظر آ رہے تھے،
 حصہ مگر داتا ہوا اور صرا بھلا، مجھے خوش دیکھ کر مسکانے لگا اور میں سے
 بھلنے کو دل نہ پاتا تھا کیونکہ سوئے غروب ہو چکا تھا اور افق کے قریب
 سیاسی مائل دھوئیں کی ایک گیر سی کھینچ گئی تھی۔۔۔۔۔ چنانچہ میں
 اولوں میں سے بھلا ادا گیلے بدن کپڑے پہن کر پھر اپنے سفر پر روانہ ہو
 گیا۔۔۔

اب میں نے سوچا کہ راستے میں کسی جگہ پر بھی نہیں رکوں گا۔ میں
 نے سائیکل پہلے سے ہی تیز چلا دی۔ کئی مرکز کا تقریباً آٹھ میل فاصلہ
 گیا تھا۔ اور کھیتوں کا راستہ تقریباً آٹھ میل ادا تھا۔ میری سائیکل ہوا سے باتیں
 کرنے لگی، نصف منزل پر ایک گاؤں تھا۔ جسے قلعہ کا بن سنگھ کہتے تھے،
 خاصہ بڑا موضع تھا۔ پانچ سات پچے مکانات بھی تھے، ایک چھوٹا سا سکول
 بھی تھا۔ پہلے خیال آیا کہ آج کی رات اسی گاؤں ہی میں گزار دوں۔ لیکن
 پھر گھر کا خیال آیا ہمارے گھر کے صحن میں ایک چھوٹا سا کنواں تھا، جس پر ایک
 لوہے کا ڈول چڑا رہا تھا، سوچا کہ وہیں پر ڈول بھر بھر کر نہاؤں گا۔ ماں کہیں
 کئی تہوں والے پرانے پکائے گی، اور میں ہڑی سرچوں کی مٹی کے ساتھ

مزے لے کر کھاؤں گا۔ اگر راستے میں کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہ ہو تو میرے
 لیے گھر پہنچنا ناممکن تھا۔ اس لیے میں نے پھر زور زور سے پیڈل چلانے
 شروع کر دیئے۔ جب میں ایک زانٹے کے ساتھ گاؤں میں سے گزرا
 تو گاؤں کے ننگ دھڑنگ بچے لے ہوئے پٹیوں والے بچے "اونے
 اونے" کا شور مچاتے میرے پیچھے بھاگے۔ اودھیاں سونگھتے ہوئے
 کالے اور منیلے کتے بھی دھم دھم لاتے ہوتے میرے پیچھے پیچھے ہوئے
 کتوں کو بے طرح بھونکتے دیکھ کر مسجد کے کچے چوترے پر بیٹھ ہوئے
 ایک نوجوان نے طیش میں آکر حق کی نئی کینچ ماری، گاؤں سے باہر
 ایک مردہ ہلی پر چپٹے مارنے والے بڑے بڑے گدھ شور و غل سن
 کر ہراساں ہو گئے۔ اور اپنے لمبے لمبے پیر پھیلاتے اور اچکتے ہوئے ذرا
 پردے ہٹ گئے، ادھر میں کسی قرار شدہ ڈاکو کی طرح بڑی تیزی سے
 بڑھا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ رز کے اور کتے بہت پیچھے رہ گئے۔ اور
 ان کا شور بھی مدہم پڑ گیا۔

آگے سنسان سڑک کے دونوں کناروں پر پاس پاس کھڑے ہوئے
 سنہیتہ کے درختوں کے سلسلے شروع ہو گئے۔ ان کے نیچے گری ہوئی
 نلک تمپاں میری سائیکل کے پسپوں کے نیچے چر رہی تھیں اور
 گاؤں کے بچوں کی طرح وہ دور تک تیزی سے چکر کھاتی ہوئی میرا پیچھا کرتیں
 اور پھر جیسے دم بھول جاتے چودہ ہنس کر ایک جگہ بیٹھ کر رہ جاتیں۔

اب اکتانار بھی نظر آنے لگا تھا، اور خفاف آسمان پر دود زرد و چاند کسی

تالاب میں تیرتی ہوئی کانسی کی کڑا ہائی کی طرح معلوم ہونا تھا۔

دائیں بائیں دودھک ناہموار زمین چلی گئی تھی، خاردار جھاڑیوں کے
سلسلے شروع ہو گئے تھے، یہاں پر بھڑکیوں کا بھی خطرہ تھا، اگر بھڑکیوں
کا کوئی حمل آن گھیرے تو پھر؟ میں خوفزدہ ہو کر سائیکل اور بھی تیزی کے ساتھ
دوڑانے لگا۔ رفتہ رفتہ مزدب آفتاب کے بعد دن کی رہی سہی روشنی بھی
ختم ہو گئی، صرف چاند کی پھلکی چاندنی چٹکی ہوئی تھی، شیشتم کے درختوں کی وجہ
سے سڑک پر اور بھی زیادہ گہری تاریکی چھا گئی تھی، میں اس سے پہلے صرف
دوسرے سفر اکیلا کر چکا تھا، لیکن درنوں مرتبہ دن ہی میں سفر ختم ہو گیا تھا،
..... میرا خیال تھا کہ دودھائی میل پر کا کو شاہ کے مقبرے کے قریب سے
سڑک پھوڑ کر اپنے گاؤں کی طرف گھوم جاؤں گا، دل کو کچھ اطمینان ہو
چکا تھا کہ کم از کم سڑک کا سفر ختم ہونے والا تھا۔

میں اندھا دھند چلا جا رہا تھا کہ آگے سڑک رک ہوئی معلوم ہوئی،
جیسے نئے سرے سے بنائی جا رہی ہو، میں نے سائیکل دھیمی کر دی، نزدیک
پہنچ کر پتہ چلا کہ واقعی سڑک بن رہی ہے، ساری ہی عجیب اکھڑی چڑی
تھی، مجبوراً سائیکل سے اتر کر ناہموار زمین پر پیدل چلنا پڑا، یہ ایک نئی
آفت آن چڑی تھی۔

راستے میں سڑک کے کنارے کنارے چٹان مزدوروں کی جھونپڑیاں
بنی ہوئی تھیں، ہم لوگ انہیں "راشے" کہا کرتے تھے، یہ "راشے" خوب
موتے تازے اور ہیبت ناک صورتوں والے ہوتے تھے، میں نے سنا

نہا کر یہ لوگ بچوں کو بور یوں میں بند کر کے کابل لے جاتے ہیں۔ اور آٹھ دس روپے میں بیچ دیتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں خوفزدہ بھی تھا، لیکن بظاہر بڑے حوصلے کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کی رزق ہوئی روشنی میں راشوں کے چہروں کے خوفناک خطوط، الجھے ہوئے بال اور ٹپکتی ہوئی سرخ آنکھیں صاف نظر آرہی تھیں۔

بڑی مشکل سے یہ راستہ بھی ختم ہوا۔ اور میں پھر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ اس وقت تک مجھے اوّل تو گھاؤں میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ یا گھاؤں کے قریب ہی ہونا چاہیے تھا، اب سوائے سفر جاری رکھنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کاکو شاہ کے مقبرے کے قریب پہنچ کر میں پگ ڈنڈی پر ہولیا۔

تنگ راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے مجھے سائیکل سے اتارنا پڑا۔ کھینٹوں میں پانی کھڑا تھا، مجھے ایک نشانی یاد تھی دو فرلانگ کے قریب ایک پرانا رہٹ تھا جو آج کل سنان پڑا تھا۔ میں نے پہلے اسی کار رخ کیا۔ جب پانی سے بہتا ہوا کنوئیں تک پہنچا تو دیکھا کہ آگے پانی اور بھی زیادہ دور دور تک پھیل ہوا ہے۔ پگ ڈنڈی پانی ہی میں گم ہو گئی تھی، میں پانی سے بہتا ہوا خشکی کے راستے پہنا گیا۔ دو ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد پانی کم ہوا۔ اور میں اندازاً گھاؤں کی طرف چل پڑا۔ لیکن بہت دور نکل جانے کے بعد بھی گھاؤں کا کوئی نام نہ نشان تک دکھائی نہ دیا۔

دھند چاندنی میں میں چلتا ہی گیا۔ اب مجھے شک گزرا کہ کہیں میں نے غلط راستہ تو اختیار نہیں کر لیا، ہر طرف بھگا ہندوؤں، بھٹیوں اور درختوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بعض بھٹیوں میں کوئی فصل بھی بھڑی نظر آجاتی تھی میں کچھ پریشان سا ہو گیا، یونہی اندھا دھند چلتا گیا، کہ دفعتاً مجھے دور سے گرد اڑتی ہوئی دکھائی دی، میں ٹھٹھک کر رک گیا، تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ کوئی ترچھا بانٹکا سا بڈی سوار چلا جا رہا ہے۔ سنسان جگہ، پھکی چاندنی، جھینگروں کا شور.... پہلے خیال آیا اسے آواز دیکھ راستہ دریافت کسروں، لیکن اس کی وضع قطع کچھ ایسی تھی کہ میں نے اسے بلانا مناسب نہ سمجھا، بلکہ موقع میں پڑ گیا کہ نہ معلوم یہ کون ہے، کاش! وہ مجھے دیکھے بغیر آگے نکل جائے، میں سمٹ کر لکیر کے ایک پھوٹے سے درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا، لیکن اس درخت کے سائے میں بھی انسان کسی شخص کی نظر دوسے ادھل نہیں رہ سکتا تھا.... اس کے ہاتھ میں ایک لمبے دستے کی کلہاڑی دیکھ کر دم اور بھی خشک ہو گیا۔

وہ اپنے راستے پر چلا جا رہا تھا میری طبیعت کچھ سنبھلنے لگی.... دفعتاً اس نے رخ بدلا اور نظر ہر میری طرف مڑا، میں نے سوچا شاید وہ اس راستے سے سیدھا آگے کو چلا جائے گا، چنانچہ میں ذرا پہلو بدل کر کھڑا ہو گیا، لیکن وہ سیدھا میری طرف آیا، اور قریب پہنچ کر اس نے سائٹی روک لی، میں نے اس کی طرف دیکھا، یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے اونٹ کے اوپر ایک اور اونٹ بیٹھا ہوا ہے، وہ ایک لمبا ترنگا اکبر سے بدی

کا منہ بڑا سکھ تھا اس کا چہرہ بیستویں تھا۔ ڈٹوٹی چھوٹی چھوٹی اور چھیدی
 سی۔ بھنویں گھنٹی، ناک جیسے پلٹ کی چو پنچ تھتھہ پھولے ہوئے۔ آنکھیں اندر
 کو دھنسی ہوئی مگر چمکدار تھوڑی مین نیچ میں سے وہی ہولی بکانوں میں
 سنیری بالیاں گلے میں سونے کا چمکتا ہوا اکٹھا۔

وہ تھوڑی دیر تک متہ کھولے میری جانب دیکھتا رہا، پھر اس نے
 پیش ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کہو بھی ٹوٹے اکون ہو تم؟“
 میرا دل ٹوب گیا، جی میں گاؤں کو جا رہا ہوں۔

”کہاں سے آ رہے ہو؟“

”شیر سے آ رہے ہو۔“

”شیر سے۔۔۔ جی؟“

”کیا کہتے ہو وہاں؟“

”جی پڑھتا ہوں۔“

”کیا پڑھتے ہو؟“

”میں اس سوال پر پھرایا۔ ”کہاں میں پڑھتا ہوں جی؟“

اس نے سائیکل کے پیچھے بندھی ہوئی گھنٹی کو کلباڑی کے دتے سے

کچو کا دیتے ہوئے پوچھا۔ اس میں کیا ہے؟

”جی اس میں میلے کپڑے ہیں۔۔۔ کیا جی کھول کر دکھاؤں؟“

وہ ہنس پڑا۔ ”بہنے دو۔“

میری جان میں جان آنُ اس نے ڈاچی کی کھیل کھینچی اور چلنے ہی لگا تھا
کہ پھر رک گیا نہ کہاں جا رہے ہو۔

جی اپنے سماؤں کو۔

مکھنڈا سماؤں نے۔

جی اکال گرٹھ۔

اکال گرٹھ۔

جی۔

اس نے قدمے سکوت کیا۔ پھر اپنے کلن کے نیچے زبان پھیرتے
ہوئے بولا۔ ادا صراؤ۔

میں ڈرتے ڈرتے اس کے قریب گیا۔ اُس نے کہا۔ سائیکل نیچے رکھ دو۔
میں نے سائیکل زمین پر ڈال دی۔ اس نے اچھڑکا کر کہا۔ میرا ہاتھ کپڑے پر
پھیرے بیٹھ جاؤ۔

میں ڈال لیکن اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔ بڑی شکل سے اس کے پیچھے
اڑکے بیٹھ گیا۔ اس نے اوپر بیٹھے بیٹھے کلناری میں سائیکل اٹھا کر اوپر کھینچ لی۔
کھیل کو جھٹکا دیا اور سائیکل اپنی بے ڈھنگی پال سے روانہ ہو گئی۔

میں نے اس کی پیٹے میں ترگروں پر نظر جمادی۔ اس کے سر کے بال اس
مقبہ کھج کر بندھے ہوئے تھے کہ اس کی گدی پر بالوں کی جڑوں کا گوشت
اوپر اُٹھ آیا تھا، جیسے خنسی خنسیاں بھل آئی ہوں۔ ہول اس نے پھر
اپنی بیٹھ ہوئی صابری آواز میں پوچھا۔

۔ تہیں سلوم نہیں کرتا ہمارا گاؤں کہ مرکوبے کیا تم بھتے ہو کہ اب تم اپنے
گھڑوں ہی کو بارے رہتے ۔

۔ جی میں راستہ بھلا گیا تھا میں پہلے شہر سے صرف دو ہی مرتبہ آیا ہوں ۔
لیکن دن ہی دن میں گھر پہنچ جاتا تھا لیکن آج رات ہو گئی اور پھر راستہ میں
پانی میں کھڑا تھا اس لیے مجھے راستے کا پتہ ہی نہیں چلا ۔

اس پر اس نے اپنی بے بک آوازیں قہقہہ لگایا : میاں ! اگر تم رات بھر
میں اس طرح چلتے رہتے تو بھی اپنے گاؤں نہ پہنچ پاتے ۔ ۔ رہتا رہے
جیسے چھوٹے لڑکوں کو رات کے وقت سنانا جگہوں میں ہرگز نہیں سمجھ سکتا
چاہیے ۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ خوب مزے مزے کی باتیں کرنے لگا ۔ پہلے
تو میں دل ہی دل میں بہت ڈرا میں نے سنا تھا کہ بعض لوگ نو عمر لڑکوں کے سڑوں
میں سے مومیاں نکال لیا کرتے ہیں ، سر موند کر چوٹی میں ایک کیل بٹھوٹک دیتے
ہیں اور ناگہان باندھ کر درخت سے لٹکا دیتے ہیں اور سر کے نیچے آگے جلا کر
ایک کڑا ہی رکھ دیتے ہیں ، آگ کی گرمی سے سر کی چربی پگھل جاتی ہے ، اور
مومیاں کیل کے سرے سے بن جاتی ہے کہ کڑا ہی میں پکتی رہتی ہے ۔
میاں ! ہم کہ سر کی ساری مومیاں بھل جاتی ہے اور لڑکا مر جاتا ہے ۔ ۔ سناٹائی
سوار کی صورت تو ہمیت ناک مزہ تھا لیکن اس کی باتوں سے کس قسم کے خطرے
کی بوند آتی تھی ، وہ بڑا سنسن ٹکڑا اور خوش مزاج شخص تھا ،
کہنے لگا کہ تمہارے گھر میں کسی نے دن کے وقت کہاں کہاں ہو گی تبھی تو

تم رات بھول گئے۔

میں سائنڈی کے کورٹن سے پھسلا جاتا تھا پناہ میں اس کی کمر سے لپٹ لگی
اس کی کمر سے کی قیض پسینے میں تر ہو رہی تھی۔ ٹیبلوں سے بجلی بجی ہوئی آرہی
تھی۔ باندوؤں کے گھنے بال پسینے میں تر ہو کر چپک گئے تھے، اُس کے بورسے
پر بندھی ہوئی بال کے نیچے کو دیکھتے ہوئے پھندے میرے نکتوں اور آنکھوں
میں گھس جاتے تھے۔ مجھے پہلے کبھی اونٹ کی سوار کی کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا
اس قدر تکلیف دہ سوار کی تھی کہ بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا، اور وہ میری
تکلیف سے بے خبر اندھا دھند سائنڈی دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ وہ
بڑا ہاتھنی شخص تھا، اس کی بھاری بھر کم بھر پور اکاڑ اور قبیلوں سے فضا
گو بیخبری تھی۔

ہم ایک ایسے درخت کے قریب سے گزے جس پر بڑوں کے گھونسلے
لٹک رہے تھے، ایک گھوندہ زمرے اس قدر قریب تھا کہ میں نے اسے
کھسوٹ لینے کیلئے ہاتھ بڑھا دیا، لیکن گھوندہ میری زور سے باہر رہا وہ کہنے
لگا ہینا بڑا سمجھ دار پرندہ ہوتا ہے وہ اپنا گھوندہ بڑی منت اور کاریگری
سے بناتا ہے، دنیا میں کوئی پرندہ اس قدر خوبصورت گھوندہ نہیں بنا سکتا،
تمہارے بانٹوں پر لٹکتے ہوئے گھوندے نہیں دیکھے، بے حد خوشنما ہوتے ہیں
جو اس لہرائی ہوئی ٹوپیاں سی بیئے چمک کر کبھی اندھ چلے جاتے ہیں، کبھی باہر
آ جاتے ہیں، اور ایک قسم کا گھوندہ بھی بناتے ہیں، یعنی ایک تو اپنے رہنے
کے لیے نرم تنوں اور تپوں سے جس میں ایک طرف کو اندھ جاتے کا راستہ

ہوتا ہے، اور دوسرا گھونسل جوڑنے کی شکل کا ہوتا ہے۔ جب بادل گھبر گھبر کر آتے ہیں، اصرہ کی ہلکی پھول پڑتی ہے، سرد ہوا کے جھونکے چلتے ہیں، تو جیسے چہرے ہونے ان پگھوٹے جیسے گھونسلوں پر پنجے جاملے جھولا جھولتے ہیں۔
مجھے اس کی باتیں بہت دلچسپ معلوم ہوئیں، میں نے کہا: سنا ہے جیسے اپنے گھونسلوں میں روشنی کرنے کے لیے جگنو پکڑ کر گھونسلوں کے اندر تنکوں میں اڑا دیتے ہیں؟

اس نے اثبات میں سر ہلا کر مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا: ہاں یہ درست ہے۔ یہ بہت ہی سیلنا پرندہ ہے۔

اس پر میں نے اسے بند اور جیسے کی کہانی سنا دی جو میں نے تیسری جماعت میں اردو کی کتاب میں پڑھی تھی، اس نے بچوں کے سہے انتہاک کے ساتھ وہ کہانی سنی، اور جب میں نے کہانی کا نتیجہ بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔
اس طرح بندر سے دوسرے جانوروں کا ذکر شروع ہوا میں نے بتایا کہ جب میں سڑک پر سائیکل چلاتا ہوا آ رہا تھا، تو کس طرح مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں کسی جاڑی میں سے کوئی بھیڑیا نہ بھل کھلے۔

اس پر وہ پھر اچھے بک بکے میں ہنستا نہیں ڈرنے کی کوئی بات نہیں اس علاقے میں بھیڑیے بہت کم ہیں، تاہم کبھی کبھار دکھائی دے جاتے ہیں، پھر اس نے بتایا کہ شیخوپورہ کے علاقہ کا آبادیوں سے پرے خوشخوار بھیڑیے غول بنا کر گھباکتے ہیں، اور وہ قدیم گدھے سمجھے کم نہیں ہوتے، میں بہت حیران ہوا، میں نے پوچھا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر اور مارا

مہلتا ہوگا تو بیڑیے اس کی تکیا بولی کر ڈالتے ہوں گے ۔

اس نے یہ بھانسنہ پھیل کر کیا نہ ہاں ۔۔۔ ایک مرتبہ ایک آدمی اور مر سے
جاسا تھا ۔۔۔ میں نے یہ بات کہیں سے سنی تھی ۔۔۔
کیا وہ کوئی بڑا طاقتور شخص تھا ۔

۱۰ ہاں وہ بہت تھکڑا آدمی تھا ۔۔۔ دوپہر کے وقت راستہ پلٹتے پلٹتے وہ
تھک گیا تو ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کے لیے بیٹھ گیا ایک جھاڑن
میں روٹی ٹہنڈی تھی اس نے روٹی کھائی اور پھر وہ درخت کے تنے سے ٹیک
لگا کر متوڑی دیر کے لیے اونگھ گیا ، پھر یکایک اس کی آنکھ کھل تو اس نے کچھ
عجیب عجیب سی آوازیں سنیں ، اور اسے جھاڑیوں میں جانوروں کی غصوتھنیاں دکھائی
دیں ۔۔۔

میں نے اچھل کر کہا : وہ بیڑیے ہوں تھے ، ہے نا ؟
۱۱ ہاں تم جانتے ہی ہو کہ بیڑیے کا دانا بہت بڑا ہوتا ہے اس کے جیرے
خون کی طرح سرخ ہوتے ہیں ، بیڑیے بہت ہی بھرا جاتا ہے ۔
۱۲ پھر کیا ہوا میں نے اشتیاق سے پوچھا ۔

۱۳ بس بھی ، وہ آدمی آٹھ کھڑا ہوا ، اس نے دیکھا کہ ارد گرد کی جھاڑیوں
میں بہت سے بیڑے بالشت بالشت بھر کا ہیں ، انہیں بکالے چور نفروں سے اس
کو گھور رہے ہیں ۔۔۔ اسے غصی ہوا کہ اب وہ بچ کر بھل نہیں سکتا ، اس نے
درخت کی طرف دیکھا تو اس کا مناس قدر پکا ٹھاکہ اس پر پھرتی سے چڑھتا ۔۔۔
تا کہن تھا ، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس کی پڑھنے کی کوشش کرے گا ، تو بیڑیے

یہ سنسنی خیز قصہ شکار وہ سائنٹسٹ کو گایاں دینے لگا، اور میں
اپنے خیالات میں کھو گیا۔ زرد و چانک پھسکی روشنی میں دور دور
ٹمکے کا لے کا لے درخت پہیلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے، کہیں بہت

دور سے کسی کے گلنے کی اڑتی ہوئی تان سناؤ دینے لگی۔ سائنڈن اپنی بے
 ڈھنگی چال سے کھنکھاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ ہم ایک اونچے درخت کے قریب سے
 ہو کر گزرے جس پر خشک لٹکیاں لٹک رہی تھیں اس نے سہاڑی کے دھتے
 سے ایک لٹکی کو نکل کر کہا: دیکھو یہ ہے تو بنی۔ بچپن میں جب ہم لوگ ہنر
 بنانے جایا کرتے تھے، تو بس اسی قسم کی تو بنی بنل میں لے کر اپنا منہ سے
 بوتل کے ماگ کی طرح تر کرتے تھے۔

لیکن میرا دھیان ابھی تک بھڑیلوں کی طرف لگا ہوا تھا میں نے پھر
 بات بھڑی کیا بھڑیے بڑے آدمی پر بھی حملہ کر دیتے ہیں۔
 اس نے دارمھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ اگر بھڑیے تدار میں
 زیادہ ہوں اور کوئی اکیلا دیکھ لے تو وہ اس پر حملہ کر دیا کرتے
 ہیں لیکن عموماً آدمیوں سے ڈرتے ہیں۔۔۔ لو میں تمہیں ایک مزید رشتہ
 سناؤ ہوں۔۔۔ یہ بگ بتی نہیں آپ بتی ہے۔۔۔ تقریباً چار برس پہلے کا بات
 ہے۔۔۔ میں اپنے خیال کو جلد بھٹا راستے میں جنگل پر مارتا تھا، لیکن مجھے
 پردہ نہ ملتی میرے ہاتھ میں ایک بڑی لمبی لاشی تھی جس کے نیچے لہجے
 کی یہ موٹی شام لگی ہوئی تھی، اگر اس لاشی کی ایک بھی ٹھکانے کی چوٹ کسی
 بھڑیے کے سر پر پڑ جاتی تو وہیں ڈھیر ہو جاتا، خیر! دوسرے کا وقت تھا
 ابھی میں جنگل میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ میں نے چونک کر دیکھا کہ میرے
 دلہنے ہاتھ کی طرف کوئی جانور جھاڑیوں میں چھپا ہوا ہے۔ میں نے جلدی
 سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ بائیں ہاتھ کی طرف جھاڑیوں

کے پیچھے ایک پھریا کھڑا ہے۔۔۔ میں چونکا ہو کر راستہ طے کرنے لگا جس جگہ بھاڑیاں فدا کم ہوتیں تو دیکھتا کہ میرے دائیں بائیں دو بھڑیے تیس تیس یا چالیس چالیس قدم کا فاصلہ دے کر چلے جا رہے ہیں، میں نے بڑھاپا لگا گھڑے پر رکھ لیا، اور ان پر نگاہ رکھتا ہوا بڑھتا چلا گیا، کبھی وہ میرے قریب آ جاتے اور کبھی پھر دور چلے جاتے جب ہم گھنٹی بھاڑیوں میں سے ہو کر گزرتے تو وہ نظروں سے غائب ہو جاتے، پھر اس وقت خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ کبیں حملہ نہ کریں اور جس جگہ بھاڑیوں کم ہو جاتیں وہ دکھائی دینے لگے، اور ان سے ایک عجیب بات تھی۔۔۔۔۔ کبھی دائیں ہاتھ والا بیڑیا بائیں ہاتھ کی طرف چلا آتا اور بائیں ہاتھ والا دائیں ہاتھ کی طرف چلا جاتا اس طرح وہ راستہ بھرا دل بدل کرتے رہے، یہاں تک کہ جنگل ختم ہو گیا، لیکن ان کو گھج پر حملہ کرنے کی جرات نہیں ہوئی، جنگل ختم ہونے پر میں تو آگے بڑھ گیا، اور وہ جنگل ہی میں رہ گئے۔

جب وہ اپنا قصہ ختم کر چکا تو میں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی اب وہ مجھے بہت ہی دلچسپ آدمی معلوم ہونے لگا تھا اس کا لہجہ اس قدر دوستانہ تھا، اور باتیں ایسی سننی پیدا کرتے والی اور مزے مزے کی کرتا تھا کہ جی پاتا تھا کہ وہ باتیں ہی کتابچا پلا جائے، میں نے امرار کیا کہ مجھے بیڑیوں کی کوئی اور کہانی سناؤ، وہاں قصوں کی کیا کمی تھی، اس نے کہا: اب میں تمہیں اپنے پرانا سا چھوٹا سا قصہ سناتا ہوں۔

پرانا یعنی میرے نانا کے باب اپنے زمانے میں بہت ہی طاقت ور

شخص بچے جلتے تھے ، ملاقات ہر کے لوگ ان سے مقرر کرنا چاہتے تھے۔ ایک
 مرتبہ میرے پرانا اپنی پوجی سے نئے کے لئے گئے ، وہاں انہیں کچھ کام
 تھا ، ڈیڑھ دو ماہ وہیں رہے ، انہیں خبر لی کہ گھر پر میرے پرانا جو اس
 وقت ہی بچے ہی تھے ، بید پڑ گئے ہیں خبر ملتے ہی پرانا بچہ نوڑا اپنے گھڑوں
 کی طرف روانہ ہو گئے ، جلد ہی میں انہوں نے اپنے ہاتھ میں لائیں ایک نرلی ،
 میں پچیس میں کا نام ملتا تھا ، وہ بڑی تیزی سے چلتے تھے ، اس وقت چونکہ
 اپنے بیٹے کی بیماری کی فکر تھی ، اسی لیے ان کی یہی کوشش تھی کہ وہ جلد از
 جلد اپنے گھڑوں پہنچ جائیں ، نصف راستہ طے کرنے کے بعد وہ ایک گاؤں
 کے قریب سے ہو کر گزرے تو اس گاؤں کے لوگوں نے ان سے کہا کہ
 وہ جس راستے سے جا رہے ہیں ، ادھر سے نہ جائیں بلکہ دوسرے راستے
 سے چلے جائیں ، دوسرے راستے سے بہت بڑا پکڑ پڑتا تھا ، اس لیے پرانا
 اس راستے سے پہلے ہی چاہتے تھے ، انہوں نے سبب پوچھا تو لوگوں نے
 بتایا کہ اس راستے پر ایک بھڑنی نے بچے دے رکھے تھے ، جو شخص ادھر
 سے گزرتا تھا وہ اس پر حملہ کر دیتی تھی ، چونکہ دوسرا راستہ بہت طویل تھا ،
 اور انہیں جلد از جلد پہنچنا تھا ، اسی لیے انہوں نے لوگوں کے کہنے کی پرواہ
 نہ کی اور یہی راستے ہی سے جانے کی ٹھان لی ، جب کوئی ایک ڈیڑھ
 میل آگے مصل گئے تو دیکھا کہ مین راستے کے پہچ میں ایک خشکیاں بیٹھنی بیٹھی
 ہے ، وہ خود سارا راستہ ساٹ کر گزرنے لگے تو اس نے ان پر حملہ کر دیا ۔۔
 انہوں نے جھپٹ کر اس سے بھڑوں کے پھیلے حصے میں جہاں مانت نہیں

ہوتے دونوں ہاتھ ڈال کر اس کا منہ پھاڑ دینے کی کوشش کی اور وہ بھجلا
لیکن زندگی اور موت کا سوال تھا، انہوں نے خونخوار جانور کو ٹانگوں میں
جکڑ کر دوزخو لگایا تو اس کا منہ پھاڑ ڈالا، وہ بہت ترپنی اور انہوں نے ایک
بڑی سہارنٹ سے اس کو بان سے مار ڈالا۔۔۔

مجھے اس کتبے میں بہت مزا آیا، اس طرح ہم باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے
تھے، گراب میں کچھ ٹھک گیا تھا، جسم بھی دکھنے لگا تھا۔
دور سے درختوں کے جھنڈوں میں سے روشنی چمن چمن کر نکلتی دکھائی
دی جب ہم اور قریب پہنچے تو باجول اور ڈھول کا یکساں شہر بھی سنائی دینے
لگا اس دیر لے میں یہ رونق اپونچنے پر معلوم ہوا کہ وہاں میل لگا ہوا ہے
یہ بڑا میل سات دن تک مسلسل لگتا تھا، بڑی بڑی دکانیں اور عبادت گاہات
کے کھیل تراشے آتے تھے، میں نے دریافت کیا کہ اب یہاں میں چلنا ہوگا،
ہاں مجھے وہاں ایک،۔۔۔ سے ملنا ہے اور اس میلے کا مطلب یہ کیا ہے
جہاں میل نہ ہو سکے۔۔۔ کیا سمجھے؟

میں کچھ نہ سمجھا۔

اب ہم ایک چوڑے ریتلے راستے پر چلے، اس راستے کے دونوں
کنارے اونپر کھائے ہوئے تھے، اور ان کناروں پر بول کے اونچے
اونچے درخت قطار در قطار میلے کے تمام تک چلے گئے۔

جب ہم قریب پہنچے تو کھائے ہوئے درختوں کے تنوں کے پتی میں سے
گیس کے بیٹے اور غصے نظر آنے لگے، جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے تو

توں زیادہ رونق دکھائی دینے لگی، طوائفوں، بھائیوں، کھاروں، کھلونے اور شربت نالودے والوں کی دکانیں، ایک طرف اور پرچیے گھسنے والے چنگھوڑے اور دوسری جانب بازوؤں پر نام یا پھول وغیرہ گودنے والوں کے اڈے، گھوڑے، گدھے، تانگے، ٹھیلے، بیل اور اونٹ بھی نظر آنے لگے۔ اس وقت خوب گہما گہمی ہو رہی تھی، مردوں اور عورتوں کے جھلڑ کے جھلڑ اصرار دھر گدوم رہے تھے۔ روشنی اندر گھسنے بجانے کی وجہ سے جنگل میں جھل جھل مہل مہل تھا۔

میلے میں پہنچ کر ایک درخت کے تلے میرے ساتھی نے ساٹنی کنڈین پر بیٹھا دیا۔ میں اتنا قومیری ٹانگیں سن ہو گئیں تھیں میں کھڑا نہ رہ سکا۔ اس نے فوراً زمین ہی پر بیٹھ گیا، وہ میری طرف دیکھ کر دانت نکال کر ہنسا کیوں نہ جھک گئے۔

میں کچھ جھنپ سا گیا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میرے جسم کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔

اس نے پوچھا: "تھیں بھوک تو لگی ہوگی خوب ذرا؟"

میرے اثبات میں جواب دینے پر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر سوانی کی سب سے بڑی دکان پر پہنچا کر ٹاپے آگ پر چڑھے ہوئے تھے بگرا گرم جلیبیاں اتر رہی تھیں پہلے تو اس نے مجھے گرم گرم جلیبیاں دلوائیں۔ مجھے بھوک بھی لگ آئی تھی۔ اس دن جلیبیاں کھانے کا بڑا لطف آیا، اس نے میری پیٹھ پر تھپکی مے کر کہا: "بس اب تم جوجی پاپے کھاؤ"

خوب پیٹ بھر کر کھجے؟

مجھے مکان پر چھوڑ کر وہ خود ایک طرف کمرل دیا۔ میں نے جوی پا اکھا بار۔
جب کما چکا تو حلوائی کے نو جوان لٹکے نے دام طلب کئے میں بڑا گھبرایا میں نے
ادھر ادھر دیکھا۔ میرا ساتھی کہیں نظر نہیں آتا تھا مجھے پیاس بھی محسوس ہو رہی
تھی لیکن اب میں خوب بچتا ہوں نے حلوائی سے کہہ دیا کہ میرے پاس دام نہیں
ہیں اس پر نو جوان حلوائی نے کہا کہ سی پر بیٹھے رہو جب تک پیسے نہیں دو
گے یہاں سے ہرگز نہیں جاتے دو گلاز میں بہت پریشان ہوا۔ تھوڑی
دیر بعد حلوائی پھر بکواس کرنے لگا۔ میں ڈکا کہ کہیں دو چار چیت ہی نہ جھاد
... راتے ہیں بطبع کل چونچے کسی تاک ڈالا میرا ساتھی بھی لے لے ٹوگ بھرتا
آن پہنچا۔ اے آتا دیکھ کہ میری جان میں جان آئی اس وقت حلوائی مسارڈ کا
مجھے کھری کھری سنار دتا تھا۔ میرے ساتھی نے آتے ہی بڑی زوردار آواز
میں اے لٹا کر کہا لے اور حای کے چلے! ... کیا کہنا ہے ہمارے چھوکرے
کو۔۔۔

پھر اس نے آگے بڑھ کر ٹیٹھا ڈال لیا۔ برآمد دار میرا نام جتا گھڑ ہے
جتا گھڑ۔۔۔ شور سن کر لڑکے کھاباپ اتھ جوڑ کر مکان سے نیچے اتر آیا۔
اور جتا گھڑ کے سامنے روتی صمدت بنا کر کھڑا ہو گیا۔ لالہ جلتے ہو میں کون
ہوں۔

لالہ نانپ رات تھا کھکے کی طرح پھولا ہوا اس کا پیٹ نیچے اوپر
جودا تھا۔ جی ان دانا جاتا ہوں۔۔۔

جہانگ نے اس کے جوان لڑکے کو گردن سے پکڑ کر اس زور سے
 پیچھے دھکیں دیا کہ وہ گرم گرم گھسی کے کڑا پے میں گرنے سے بال بال بچا۔ نہ
 تو پھر اپنے اس نشے کو بھی تبادو کہیں بھے اس کا بھر کس نہ مکان پڑے
 ۔۔۔ کیوں بے سوز تھے اتنی جرات کیونکر ہوئی کہ تو ہلے لڑکے پر پیسے
 لینے کے لیے چڑھو دڑا ۔۔۔ وہ لال لال آنکھیں نکالے لالک طرف بڑھ
 رہا تھا، ادھر ادھکے لوگ بھی آن جم ہوئے، لالہ نے کہو سامنے لڑکے ہوئے
 کہا جی میں نے پیسے نہیں مانگے۔۔۔ اہی مجھ تو معلوم بھی نہیں ہو اس ہمارا ہے
 نے کہ پیسے مانگے شروع کر دیئے :

جہانگ نے کہا : خون پی لو نکاحون ۔۔۔ یہاں انگریز کاراج نہیں میرا
 راج ہے ۔۔۔ کہو تو دکان برابر کروں صبح تک :

اتنے میں ایک اور قدار سلطان نوریان آگے بڑھا : اے بانے دے یا بطل ہو
 گئی بیچارے سے : جہانگ نے گھوم کر دیکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ دونوں
 بٹل گیر ہو گئے، شاید بہت دنوں بعد مفل و مستول کا ٹپ ہوا تھا، نو وارد
 بھی ایک خوشنوار گدھک طرح دکھائی دیتا تھا۔

سلطان کو اتنی تنبیہ ہی کافی سمجھ گئی، اس کے بعد ہم لوگ میلے میں گھومنے
 لگے، وہ دونوں بہت دیر تک مقدیوں، پولیس اور محتانے ویزہ کی باتیں
 کرتے رہے :

میلے سے فضا ہٹ کر ایک جگہ کھچے کھیت میں انڈے بچا رہے تھے،
 لوگ یک بڑے گھیرے میں بیٹھے تھے، سچے کا دور چل رہا تھا، کچھ لوگ اٹھیں

تبلوں میں رہنے ان کے سہارے سج میں کھڑے تھے، بعض لائٹسوں پر ٹھنڈیاں
 ٹھکانے اچکے ہوئے کھڑے تھے۔ انور نے بجانے والے کے قریب ایک
 گھجروں کا تھکان پر دھبے بڑے مزے میں ہڈیوں بجکتی سا قندہ کا کا کر سنا
 رہا تھا، ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا صرف گانے والے کی دُرد میں ڈوب
 ڈوب کر ابھرنے والی آواز فضا میں گونج رہی تھی، جب گانے والا ایک بول
 کہہ کر خاموش ہو جاتا تو انوروں کی لپکتی ہوئی دلکش آواز دوبارہ کے درمیانی
 وقفہ کو اور بھی دلکش بنا دیتی۔

ایک اور جگہ بہت عجیب سی، خوب بڑا بچا ہوا تھا، جب ہم قریب پہنچے تو
 دیکھا کہ لوگوں نے ایک رنگین مزارع سرست بوڑھے کو گھرے میں لے رکھا
 ہے، بوڑھے کی سپید داڑھی اور لمبے لمبے چٹے ہوا میں اڑ رہے تھے، پہلے وہ
 ایک ٹیسی ہانک لگا کر بڑی لے کے ساتھ کوئی عریاں سی بولی سناتا، لوگ
 قہقہے لگاتے اور وہ ہاتھ اٹھا کر چٹکیاں بجاتا اور کہنیاں بلاتا ہوا اچھل پھل
 کر قریب کرتا تھا، اس کے منہ میں ایک دانت بک نہ تھا لیکن آنکھوں میں ہلا کی
 چمک تھی، پھر اس نے بڑی شوخ نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھا اور بلند آواز
 میں پکار کر بولا،

اوسے۔۔۔ نالے بابا کبیر کھا گیا۔

نالے دے گیا روانی کھوٹ

ہو ہو

نالے اوسے بابا، ہر طرف سے تحنیں اور آفریں کی صدائیں بلند ہوئیں۔

ہم اس طرح گھومتے پھرتے چلے بارے تھے، جہاں گنگا اور اس کا دست مقابل کی طرح آگے کو جھک جھک کرتا یاں بجاتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے، میں ان کی لمبی لمبی ٹانگوں پر چڑھ رکھتا ہوا ان کے ساتھ ساتھ تھارتے میں جہاں گنگا میری طرف غالب ہوا کا کارہہ کیا نام ہے تھارتا۔۔۔ میں بکری جگہ کہنے ہی کھٹک کر پیکا پیک کر گیا، رونہ میرا خوب مذاق اڑا رہا تھا، میں نے سنبھل کر اصل نام بتا دیا۔

تم نے کبھی اونٹنی کا دودھ پیا ہے۔۔۔ انا! بہت ٹھنڈا ہوتا ہے، اوں تھیں ایسا دودھ پلائیں کہ بس یاد ہی کیا کرو گے۔

ہم میلے سے ذرا پرے ہٹ آئے، ایک جگہ بیت سی اونٹنیاں بندھی ہوئی تھیں، ادھر ادھر کھلے میدان میں چار پائیاں بھی ہوتی تھیں، اور ان پر میلے کھیلے کپڑے پہنے ہوئے آدمی بیٹھے دکھائی دے رہے تھے، روشنی کی کمی کی وجہ سے ان کے چہرے صاف طور پر نظر نہ آتے تھے، ہم بھی ایک چارپائی پر جا بیٹھے، جہاں گنگا نے اپنے سامنے دودھ ڈالیا، اور پھر تین ٹنڈیاں دودھ کی بھری ہوئی لایا، وہ دونوں تو اپنی اپنی ٹنڈیوں میں ایک ہی سانس میں پڑھا گئے، لیکن میں باوجود شدید پیاس کے تین ساڑھے تین سیر کی ٹنڈی نہ کا۔۔۔ چنانچہ جہاں گنگا میری ٹنڈ کا دودھ بھی پی گیا، وہاں سے اٹھ کر ہم پھر میلے میں واپس چلے آئے، ہم بہت دیر تک گھوم چکے تھے، ارد گرد کے دیہات سے آتی ہوئی عورتیں بھی واپس جا رہی تھیں، اگرچہ اب رونق کافی تھی لیکن جہاں تک عورتوں کا تعلق تھا، محفل پہلے کی نسبت کچھ سرد پڑ چکا تھا۔

ایک طرف مبرے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، ایک سفید پوش بزرگ سیاہ
 کپڑے پہنے تخت پوش پر جلوہ افروز تھے، دانتوں میں حقے کی نئے دہی عتی
 ادھر ادھر عقیدت مندوں کا جگمگا تھا، چند جوان عورتیں ہارنگار کرنے کے
 بعد پاؤں میں گھنگرواں بندھ رہی تھیں طبع پر اٹھلا جلد ہاتھ، کچھ وقفے کے بعد
 محتجب محتجب تحاب کی آوازیں سنائی دینے لگیں، ایک طرف ساکنی نواز بیٹھے سائیکلو
 کے کان مروڑ رہے تھے، ادھر ان کے استغول میں پکڑے ہوئے گزرتے جلتے
 اور ادھر ان کے بٹے بڑے پگڑیوں والے سر بھی بڑی آہنگی کے ساتھ
 حرکت کرتے سب لوگوں کی نگاہیں ان عورتوں پر جمی ہوئی تھیں، جوں کا کھا
 کر سو سو طرح سے اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی تھیں وہ اچھی طرح جانتی تھیں
 کہ سیاہ پوش پر کی سرنگیں آنکھوں سے لے کر معمولی سے معمولی شخص کی کھلی
 تک سب انہیں کی شدید اذیتیں۔

جہاں گھڑ کے دوست گئے غمراہ بچنے کا ارادہ ظاہر کیا، جہاں گھڑ کا بھی
 خیال تو ہی تھا لیکن شاید میرے خیال سے اس نے وہاں زیادہ دیر تک رکنہ نہ کیا
 شیں سمجھا، اس لیے وہ دوست سے رخصت ہوا، اور ہم لوگ اپنی ساٹھٹی
 کی ٹیکل پکڑ کر میڈے سے چل بکھے۔

جب ہم میڈے سے باہر آ گئے تو سامنے مہر گئی گھنی جھاڑیاں اول اپنے
 اونچے درخت تھے۔ سب سے دائیں بائیں اب بھی کوئی اکاؤ کا خیمہ نظر آ
 ہی جاتا تھا، تھوڑی دور جانے کے بعد جہاں گھڑ ٹک گیا۔۔۔ اس نے مجھے
 وہیں ٹھہرا یا اور سانڈی کی جہاد میرے ہاتھ میں دے کر خود اس ریستے سے

کے اونچے کنارے کی طرف نئے کر کے تن کے ایک اور درخت کے قریب پہنچا۔

وہ درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ درخت کے سائے میں کیا لڑکانہ صورت تنے کی اوٹ میں سے باہر نکلی۔ وہ دونوں ہنس پرہے اور بہت آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

مدھم روشنی میں اس صورت کی صورت صاف طور پر نظر نہیں آتی تھی۔ البتہ وہ باتیں کرتی ہوئی اپنی جگہ سے ایک طرف کدھٹ جاتی تو چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کے خطوط صاف صاف دکھائی دینے لگتے۔

وہ ایک خوبصورت ہوئی جنگلی بی کی مانند تھی اس کے چلنے کا انداز بھی اس میں ملائی بی کی طرح تھا جو پیٹ بھر کر چوپے کھا لینے کے بعد خوش کرتی ہو خوب کھینچی تھی ہوئی وہ ششامش گوشت کا ترپتا ہوا ایک محکوم تھی۔۔۔ بے خبری سے کی تاش یا میٹھے انگور کے کیڑے بھری چاک۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی اور منی کی ناجی بکل مار گئی تھی جس میں سے اس کا صرف چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ اگر اس کے صحت و رگاموں پر اس قدر گوشت نہ تھا اس کی آنکھیں خوب بڑی بڑی دکھائی دیتیں۔ اور لچکتی کھار تھیں اور دانت صاف و شفاف اور آبدار اخروٹ کے درخت کی پھل سے رنگے ہوئے مسوڑھوں میں سے بیٹتے وقت اس کے دانتوں کی چمک بھلی کی طرح کوند جاتی تھی۔ اس کے ہونٹوں میں سمندے کی لہروں کا سا مدوجند پیدا ہوتا اور وہ گرم ریت پر پڑی ہوئی کسی پھلی کی طرح پیچ و تاب کھانے لگتے تھے۔

وہ دونوں جگہ سے کچھ فاصلے پر تو تھے ہی، پھر وہ باتیں بھی بہت دھیرے
 دھیرے کر رہے تھے، کم از کم میرے کان میں کچھ نہیں پڑنے دیتے تھے
 البتہ عورت کے ہونٹوں کے اتار پڑھاؤ اور چرخ و خم سے سدوم ہوتا تھا کہ
 مضامین کے دفتر کے دفتر کھولے جا رہے ہیں۔۔۔ کبھی شوخ نظروں سے
 اس کی طرف دیکھ کر ٹھیکہ کا کھانے کے انداز میں اوپر والا ہونٹ بیچ کر بچے
 کا ہونٹ آگے بڑھا دیتی۔۔۔ اس نے اپنی چندریکا کو سنوارا تو اس کے سیاہ
 گھنے اور لمبے بال بارش کی بوچھاڑ کی طرح باہر نکل پڑے، اس کی خوش وضع گردن
 کی جھلک بھی طر بھر کر دکھائی دی، اور پھر اس کی بادل نما اوڑھنی میں دلپوش
 ہو گئی، وہ مستی میں آن ہوئی کبوتری کی طرح اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔۔۔ جہانگھ
 نے غالباً اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا، عورت
 نے فری سے اس کا ہاتھ راستے ہی میں روک دیا اور بڑے بانچپن سے
 جھٹک کر سپردگی کے انداز میں اس کے قریب ہو گئی، اور اس کے کان کے
 پاس سرگوشی میں کچھ کہا، جہانگھ نے میری طرف دیکھا اور کھٹکھٹا کر سنس پر
 ۔۔۔ پھر جہانگھ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

پتوں میں سے چمن چمن کر آنے والی چاندنی میں عورت کی تیز آنکھوں میں
 سے روشنی کی شعلیں سی نکلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔۔۔۔۔ اور
 جب جہانگھ واپس لوٹا تو وہ درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو
 گئی، اور کچھ غمناک آنکھوں سے جہانگھ کی طرف ٹکٹی بانہ بھ کر دیکھنے لگی
 اس کا ایک گمال درخت کے تنے سے لگا ہوا تھا۔

ہم پرستور سابق سائڈنی پرسوار ہو گئے، اور سائڈنی پہلے کی طرح
 بے ڈھب پال سے بھاگ نکل، کائی دور آ جانے کے بعد میں نے گھوم کر
 پیچھے کی طرف دیکھا وہ عورت ابھی تک اسی طرح درخت کے تنے کے ساتھ
 سمٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔

جب ہم کھیتوں میں پہنچ گئے، تو جہانگیر نے اپنا ہتھوڑے جیسا منہ
 کھول کر مڑی طرف دیکھا۔ اور تاک کی بجائے منہ سے سانس لینے لگا۔ اس کی
 چھوٹی موٹی مونچھوں کے تنے اس کے کچھ بھتہ ہونٹوں پر شوخ سکراٹھ
 کھیل رہی تھی، ہماری سی آواز میں بولا: کیا سوچ رہے ہو؟
 میں کچھ جھینپ گیا۔

سائڈنی پھلا ہونٹ آگے کو بٹھلے کسی روشنی رانی کی طرح ٹھک
 ٹھک کر چل جا رہی تھی۔ جہانگیر نے لوہے کے کڑے والا ماتہ اٹھا کر
 کان پر رکھ لیا ایک مٹی ہنک لگائی۔ اس کے منہ میں سے پیچھڑوں کی پوری
 قوت کے ساتھ زندگی سے بھرپور آواز نکل جو فضا میں پھیلنے چلی گئی۔ اس
 قدر آواز اور بھرپور آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی اس کی آواز میں
 موسیقی نہیں، لیکن ایک ایسی شمش، ایک ایسا غلغلہ اور کرار اپن تھا جس
 پر رنگیت سے بھرپور ہزاروں آوازیں قربان کی جاسکتی تھیں، لمبی ہنک کے
 بعد وہ گانے لگا۔

ارے

میں نے لاں تخت لا ہوسا المرئیں لاہور کے تخت پر چاہوں

میں کھو لاں راجے دیاں رانیاں (میں راجے کی رانیاں بچیں لوں)

اوسے - ہومو

پھر اس نے بلند تہمت بہر لگایا، تو میں تمہیں ایک اور گانا سناتا ہوں -
بہت مزے کا گیت ہے، ایک عورت جس کا نام بھاگن ہے اپنے - - یعنی مجھے نا
اس سے پڑھتی ہے -

”تیں وے کتے چلے او“

”ہاں لے مکھ کہاں چلے ہو تم، تم کہاں چلے ہو۔“

حاکماں تسی تسی وے کتے چلے او

اب ماکھ جواب دیتا -

”نی وِل چلے اُن“

”بھاگنے! اسی، اسی نی وِل چلے اُن“

اس پر بھاگن کے دل میں لٹو بھٹنے لگتے ہیں کہتی ہے

”تیں وے کی یاد و گے“

حاکماں! تسی تسی وے کی یاد و گے

بھلا ماکھ بھاگن کے لیے کچھ لانے سے کب چوک سکتا تھا، لیکن اس

موقع پر اسے شرارت سوجھتی ہے، وہ اصل تھے ماکھ کو کرتا نہیں بلکہ

کہتا ہے -

”تیں نی! بن یاد و گے“

”بھاگنیں! اسی، اسی نی یاد و گے“

نی کا نام سن کر بھاگن سماج کٹ جاتا ہے، حیرت و حیرت جاتے ہیں، پوچھتی

ہی کی گرے گی

۱۰۔ حاکماں! بی بی کے کی گرے گی۔

حاکم نکلیوں سے بھاگن کی طرف دیکھتا ہے، اس کے ہم ہو جانے
سے نکتہ اٹھتا ہوتا ہے۔

۱۱۔ بی بی نہ ہوندر مارے گی

بھاگیں بی بی، بی بی نہ ہوندر مارے گی۔

بھاگن اس بات پر بظاہر مسرت کا اظہار کرتی ہے اور پھر طنز و لہجہ

ہے۔

پتی کون بنے گا۔

حاکماں! پتی پتی کے کون بنے گا۔

اب ماکم کی باری تھی، بھاگن سمجھتی تھی کہ اب ماکم سے کوئی بات نہ بن
پڑے گی، اب ماکم نے پہلے تو بھاگن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرم
گئی جب شرم کے مارے بھاگن کے رخسار سرخ ہو گئے تو اس نے کہا۔
پتی تو بنیں گی۔

بھاگنیں پتی پتی تو بنیں گی۔

اور ہو ہو ہو

ہاکیوں میرا گھنا پسند آیا

گانا تو خیر جو تھا سو تھا ہی، لیکن گاتے میں جو زندگی اور سکڑ اور اس کے انداز میں جو بے باکی تھی وہ مجھ بہت پسند آئی۔
اس نے پوچھا "تم بھی گانا بانتے ہو؟"

میں گانا نہیں جانتا تھا، کاش میں اسے گانا گاکر ہی نہ سکتا، میں نے باتوں ہی باتوں میں پوچھا

وہ مسلمان کون تھا؟
وہ سنیں پڑا: "وہ میرا بگڑی دوست ہے مجھے، بڑے بڑے گھر کے بعد بڑے گھر سے آیا تھا، اچھا ہی ہوا جو مجھے مل گیا،
بڑا گھر کیا ہوتا ہے؟"

اسے تم بڑا گھر نہیں جانتے، اے افسوس تم بڑے گھر کبھی نہیں جانا سیکو گے، صرف بڑے آدمی ہی بڑے گھر میں جاسکتے ہیں۔۔۔۔۔ میں سرکار بہادر رہا، سہوکر بڑا گھر صرف اپنی لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو سرکار کی خدمت کرتے کرتے تنگ جاتے ہیں، تو انہیں آرام کرنے کے لیے بڑے گھر میں بھیج دیا جاتا ہے، وہاں وہ المیہاں سے بیٹھ کر سرکار فلوور پر جاکی سیوا کے نئے نئے ڈھنگ سوچا کرتے ہیں، چنانچہ جب آرام کرنے کے بعد سرکار کے بڑے گھر سے نکلتے ہیں تو پھر نئے نئے طریقوں سے بڑے زور شور سے پر جاکی سیوا کرتے ہیں پر با سرکار سے ان کی پر زور سفارش کمر لے ہے، سرکار جتنی زیادہ خوش ہوئی ہے اتنی ہی جلدی ان بیلو کوں کو بڑے گھر میں بھیج دیتا ہے جو شخص جتنی زیادہ تنہا ہی کے ساتھ خدمت کرتا ہے، اتنے ہی زیادہ خرچہ کے لیے اسے آرام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

میں بہت دیر تک اپنی عقل کے مطابق بڑے گھر کی بابت سوچتا رہا، جہاں گھر
 سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا میرے اس دوست کا نام تو ہے اس
 کے بڑے گھر میں جانے سے پہلے ایک مرتبہ ہم دونوں ایک گھاؤں میں رات کے
 وقت کسی کے گھر میں گھس گئے، ہر طرف ٹانٹا تھا ہم ہر آہٹ پر کان لگائے
 ہوئے تھے، کوئی غیر معمولی آواز نہ آئی، لیکن جب ہم باہر نکلنے لگے تو کیا
 دیکھتے ہیں کہ جس مکان کے اندر ہم گئے ہوئے تھے، اسے گھاؤں کے لوگوں
 نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔۔۔

آپ لوگ اس گھر میں گئے ہی کیوں تھے۔

اوپر! دیکھو ننھے ایسی باتوں میں ٹوکان اچھا نہیں ہوتا، بس تم یہ سمجھ لو کہ
 کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی وجہ سے کسی نہ کسی شخص کے گھر کے اندر گھس گئے
 تھے، گھروں سے ہوئے تھے، یہ پتہ نہیں گھر والوں کی نیند کیسے کھل گئی
 اور وہ سب گاڈل والوں کو کس وقت بلائے۔۔۔ اتنے آدمیوں کا اجتماع
 دیکھ کر ہم بہت گھبرا گئے، چپکے سے دیک کر بیٹھ رہے سوچتے تھے کیونکر جمع
 دسالم باہر نکلیں، کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، پھر یہ بھی کھٹکا لگا ہوا تھا
 کہ یہیں پٹے پٹے مسج نہ ہو جائے، یا پھر وہ لوگ کہیں سے پولیس ہی کو
 نہ بلا لائیں، چنانچہ ہم دونوں نے مشورہ کیا، اور ایک دوسرے کی پیٹھ کی
 طرف پشت کر کے باہر نکلے تو دیکھا کہ وسیع صحن اور گلی میں آدمی ہی آدمی
 کھڑے ہیں، لاشیاں چارے ایتھوں میں تھیں، بس ہم نے لاشیاں چلائی
 شروع کر دیں، چارہ جان پر بنی ہوئی تھی، اس قدر جانکا ہی سے ہم نے

آج تک لامٹی نہیں گھائی تھی، لوگوں میں میں پیدا ہو گئی، لائشیلو کی زد سے بچنے کیلئے وہ ادھر ادھر چنے گئے۔ ایک جہاں کا تو جنگڑا بن گئی، لیکن جب ان لوگوں نے دیکھا کہ ہم تعداد میں صرف دو ہی ہیں تو پیران کا حوصلہ بڑھا، اور وہ ایک کپکپ ہمارے قلوب پہنچنے کا کوشش کرنے لگے، ہم بھی اہل زبان ہو گئے، ان کے گھیرے میں سے نکل کر جو ہم جہاں گئے تو آٹھ کوس تک جہاں گئے ہی چلے گئے، تاکہ وہ لوگ گونسل پر سوار ہو کر ہمیں گھیر نہ لیں۔۔۔۔۔ مجھے میرا یہی درست میرے ہمراہ تھا، اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہیں پر ان تیاگ دیتا۔

مجھے بہت تعجب ہوا، کیا سارے گھاؤں میں ایک بھی شخص ایسا نہ نکلا جو آپ کا مقابلہ کر سکتا؟

”کہاں تبیا! ہمارا مقابلہ کرنے کیلئے تو ان پاس پڑوس کے گھاؤں میں سے بھی کوئی نہیں نکل سکتا تھا، ہاں اگر کہیں میرے ماموں جیسا کوئی آدمی ہوتا وہاں تو پھر تارسی وال نہیں گل سکتی تھی، کیا آپ کے ماموں بہت طاقتور شخص ہیں۔“

”طاقتور؟۔۔۔ میرے ماموں اس قدر طاقتور شخص ہیں کہ بدھرادھو کے لوگ انہیں ”سب کہتے ہیں۔“ بڑا جھاکا ڈیل ڈول ہے ان کا، تقد میں تو خیر مجھے بھی کچھ کم ہے، لیکن ان کی لٹکار ہی ایسی زبردوار ہوتی ہے کہ کسی شخص کی ہمت نہیں پڑتی کہ ان کے سامنے سر بھی اٹھا سکے، ان کا علاقہ بھر میں بڑا دبدبہ ہے۔۔۔“

”کیا وہ کبھی چوڑوں کے ساتھ بھی لڑا کرتے ہیں، کبھی کوئی لڑکی کو بچڑا انہوں نے، انہوں نے بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں، تمہیں میں ان کی زندگی کا ایک چھوٹا

سب سے پہلی بات یہ تھی کہ وہ رات کے موسم میں رات کے وقت وہ
 گاؤں سے باہر مویشیوں کے باڑے کے چھاؤں کے قریب چارپائی ڈالے ہوئے
 تھے ان کے سب مویشی باڑے کے اندر بند تھے، اتنے میں وہاں چوراہے اور
 (بیس گہری نیند میں مڑھوش پاکر اندر گھس گئے، اور بیلوں کی ایک بہت عمدہ جوڑی
 نکال کر مل دیئے، ابھی وہ بیل ابھرتے ہوئے کوئی چالیس پچاس قدم ہی گئے
 ہوں گے کہ دفعتاً میرے ماموں کی آنکھ کھل گئی، اور وہ قہراً بھانپ گئے کہ چور
 ان کے مویشی لئے جا رہے ہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پکار کر بولے: یہی تم
 جو کوئی بھی ہو۔۔۔ میری بات کان کھول کر سن لو۔۔۔ تم میرے مویشی تو لیے جا رہے
 ہو بڑی خوشی سے یہاؤ، لیکن اتنی بات یاد رہے کہ تم انہیں جہاں کہیں بھی لے جاؤ گے
 کل کے دن کے اندر اندر اگر میں اپنے مویشی واپس نہ لے آؤں تو میں اپنے باپ
 کا شیٹا نہیں۔۔۔ اور یہ بھی سن لو کہ میرا نام دسوندھا سنگھ ہے۔

وہ آدمی کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑے مشورہ کرتے رہے پھر ان میں سے ایک
 شخص بلند آواز میں بولا، دسوندھا سنگھ سردار! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ تمہارا
 بیل ہیں نہ نہیں؟ معلوم تھا کہ چارپائی پر تم ہی سوئے پڑے ہو، ہم نے تمہارا
 نام سن رکھا ہے، اس لیے ہم یہ بیل اسی جگہ بھوڑے جاتے ہیں، انچانچہ انہوں
 نے دونوں بیل باڑے کی طرف اکٹھے دیئے اور خود اپنی راہ پر روانہ ہو گئے۔
 لیجئے اس کی باتیں سننے میں بڑا مزا آتا تھا، خاموش رات میں سانڈل کے گلے
 میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن میں اس کی گونجتی ہوئی آواز ایک خاص کشش
 رکھتی تھی، میں اس سے کوئی بات دریافت کرنے ہی نہ تھا کہ ایک بڑے ننڈ کی پسکار

سنائی دی، دیکھا تو پرے ایک اونچی سی جگہ پر ایک چمن دار سانپ چمن اٹھائے لہرا رہا ہے
میرے جسم میں بجلی کی ایکے دس دوڑ گئی، جہاں گھٹنے سانپ لٹی روک لیا۔
کچھ دیر تک وہ سانپ کی طرف دیکھتا رہا، یہ سانپوں کا راجہ ہنگ ہے، اُن کس قدر
کالا ہے، اگر یہ کسی کو کاٹ لے تو اسے پانی مانگنے کی مہلت نہ ملے۔

پھر اس نے مجھے سانپ لٹی پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود نیچے اتر گیا سانپ
ابھی تک چمن اٹھائے لہرا رہا تھا، جہاں گھٹے کے کندھے سے چادر آہر کر بائیں ہاتھ
میں پکڑ لی اور دائیں ہاتھ میں لاشی لیکر وہ آگے بڑھا، وہ چھوٹے پتھر کی طرح رکھڑکا
تھا، اس وقت وہ ایک اصل مرغ کی طرح چونکا ہوا تھا اس کی گھنی ہڈوں تلے اس کی
تیز آنکھیں کھل رہی تھیں اس نے اپنا منہ کھڑا کلائی سے جیسے پٹاکر بانہ پر پھینسا
لیا، سانپ کے قریب پہنچ کر وہ کھڑکیا اور سانپ کی نظروں سے نظریں ملکر کھڑا ہو گیا۔
میں ہل گیا، میں نے اسے آواز دے کر واپس چلے آنے کے لیے کہا لیکن اس نے میری طرف
دیکھے بغیر چپ رہے، اشارہ کیا، اور خود سانپ کے اور بھی نزدیک چلا گیا۔

میں نے ادھر ادھر سے نظریں دھساکر دیکھا کوئی آدمی، جانور یا پرندہ نظر نہیں آتا تھا۔
چاند کو دیکھتا اب کچھ تیز ہو گئی تھی، بادل کے مدھت چپ چاپ کھڑے تھے، مان کی شاخوں
کی ٹانگ کو ٹپلیں تک مان تھیں، وہ ایسی بے اعتنائی کے ساتھ کھڑے تھے جیسے انہیں
اس بات سے دور کا بھی تعلق نہ ہو، اس سناں تھاں پر انسان اور ناک کا تابلہ
میرے لیے کیسٹی اور عجیب شے تھی، مجھے یقین تھا کہ سانپ دھوکے سے جہاں گھٹ
کی نیکی ٹانگ پر دانت مارے گا، اوردہ اسی وقت تڑپ تڑپ کر مر جائے گا، میرا
علق تھا کہ ہمد تھا میں چاہتا تھا کہ وہ واپس پلائے لیکن وہ میری بات سن رہی

کہ تھا باب وہ مدت بھی بہت پیچھے رہ گئی تھی، وہ نہ میں بھاگ کر اسے ہی بلا
 لقا، وہ تو اسے روک سکتی تھی۔

جنا گھسکے بول پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، وہ اس وقت ایک چنل بچے
 کلرٹنڈی اور کھنڈراو کاٹی دے رہا تھا، سانپ کے قریب کھڑے ہو کر وہ اچک
 کر اپنا تہیند اس کے پین کے قریب لانے لگا، سانپ نے بھی پین بڑھا بڑھا کر دو
 تین مرتبہ اسے کاٹنے کی کوشش کی، ایک مرتبہ جو اس نے ذرا بڑھ کر چادر اس کے قریب
 کی تو ٹھہر، سانپ اچھل کر پادر سے لپٹ گیا، جانا گھسکے نے چادر زمین پر پھینک کر
 اسے لاشی سے پٹیا شروع کیا، ایک لمحہ کیلئے سانپ اس کے پاؤں کے قریب دکھائی
 دیا، پھر وہ بھاگ نکلا، جانا گھسکے بھی اچھل کر اس کے پیچھے پیچھے ہو گیا، پھر وہ ہمارے
 ریتی زمین پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے، سانپ لپٹ لپٹ کر اس پر حمل کرتا تھا،
 تھوڑی ہی دیر میں وہ بہت دور نکل گئے، جانا گھسکے کی لاشی بار بار ہماری بلندہ
 ہوتی تھی، اور پھر دفعتاً سانپ کا گھسکے زمین پر گر پڑا، اور وہ اٹھا اور پھر گر پڑا، اور میرا
 دھڑکنے والا دل دھک سے ہو کر رہ گیا شاید عورت جس سے وہ تھوڑی دیر پہلے
 سینس سینس کر باتیں کر رہا تھا، ابھی تک درخت کے تنے کے ساتھ لگی ہوئی۔
 جانا گھسکے پھر اٹھ کھڑا ہوا، پھر بڑے بڑے ٹنگ بھرتا ہوا میرے قریب آیا میں نے گھبرا
 کر پوچھا۔

کیا سانپ نے آپ کو کاٹ کھایا تھا۔

نہیں تو وہ نہیں کر بولا، واں گیل زمین تھی، میرا پاؤں رپٹ گیا، دیکھو میرا
 کچا کچا کھنڈر اب ہو گیا، گر کر میں اسے اٹھنے لگا تو پھر گر گیا۔۔۔

تو سانپ بھاگ گیا؟

بھئی نہیں سانپ کو بھاگنے بھی دیتا میں تم جانتے نہیں اگر یہ سانپ ایک مرتبہ زخمی ہو کر پنج بجے تو اپنے دشمن سے انتقام مزد لیگا۔ اسی لیے میں اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ اب تو رینٹ اس کا سر اچھی طرح کھل کر نکھ دیا ہے۔ وہ آؤ نیچے اتر دیتیں میں سانپ دکھا لائیں۔

جب ہم مرے ہوئے سانپ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ کم از کم چھ یا تھلہا سانپ تھا پیٹھ بالکل سیاہ تھی ریٹ بیٹا اُن تھلہاں کھایا ہوا مردہ سانپ اب بھی اس قدر خوفناک دکھائی دیتا تھا کہ اس کے نزدیک جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس بات کی مزید تسلی کر لینے کے بعد کہ سانپ واقعی قطعاً مر چکا ہے ہم واپس اگر سائنٹل پر سوار ہو گئے۔

میں نے زندگی میں اس قسم کے سنسنی خیز واقعات کم ہی دیکھے تھے مجھے ابھی تک پسینہ چھوٹ رہا تھا جہاں گھوک جہالت اور احمقانہ حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی لیکن وہ پوسے دھوک کے ساتھ نیچے اترتا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ سانپ کو مار ڈالے گا لیکن میں رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ اگر کہیں سانپ جہاں گھوک کو کاٹ ہی کھاتا تو کی ہوتا جہاں گھوک نے سائنٹل کو کھانا کرنا سمجھتے ہوئے کہا یہ سانپ بہت خاتم ہوتا ہے یہ گھوکے کا دشمن منہ میں لے کر دو دھول جاتا ہے اور کبھی کبھی انسان ذات کا دشمن بن بیٹھتا ہے۔ اس وقت اس کی کارستانیاں بہت بڑھ جاتی ہیں جو آدمی دکھائی دے اسے کانٹے سے نہیں چوکتا، ایسا سانپ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑی شکل یہ ہوتی ہے کہ یہ جانور بھی چوٹا سا ہوتا ہے اور بے بہت پہلاک اور

اس کو مار ڈانا بھی آسان نہیں بس ایسے سانپ سے فارگو رو ہی بچائے ۔
اس طرح باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ جہانگیر نے کہا : بولو رسالت
تہا را ہی گاؤں ہے نا ؟

میں اس کی باتوں میں اس قدر گمن تھا کہ مجھے ادھر ادھر کا کچھ خیال ہی نہ رہا
تھا۔ اب ہم گاؤں کے قبرستان کے قریب سے گزر رہے تھے۔ جھڑیوں کے بیچ میں
اجری اجری زری پانڈی رات میں اور بھی زیادہ بیاہک دکائی دے رہی تھیں ۔
سامنے غم کے درختوں کے تلے چاروں کانوال بھی نظر آ رہا تھا۔ کنوئیں کی چنی تاریکی
میں کسی نقاب پوش آدمی کی طرح دکائی دے رہی تھی۔ گاؤں سے باہر کوڑے
کرکٹ کے ڈھیر تھے جہاں دن کے وقت مرغیاں اور ان کے ننھے ننھے چوڑے پنجوں
سے زمین کریتے پھر کرتے تھے۔ پرے چوڑے چوڑے درختوں کا جھنڈ تھا جو ایسے
دکائی دیتے تھے جیسے چور گاؤں میں گھسنے سے پہلے آپس میں صلاح مشورہ کر
رہے ہوں ۔

جب ہم گاؤں میں پہنچ گئے تو گاؤں کے عین سرے پہنے ہوئے ریٹ کے
قریب جہانگیر نے اپنی سائیکل بٹادی میری سائیکل اتاری پھر خود اتارا اور
مجھے بھی اتارا۔ میری گھڑی میرے حوالے کر دی ۔

گاؤں پر اس وقت ٹالہا چھایا ہوا تھا کوئی شخص دکائی نہ دیتا تھا۔ رات آدمی
کے قریب گزر چکی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے مکانوں کی چھتوں پر پڑے سو رہے تھے
صرف گاؤں کے دوسرے سرے سے کتوں کے جھونکنے کی کبھی کبھی آوازیں آرہی تھیں

اس نے چلتے ہوئے رہٹ سے پان پیا۔ پانی کی بوتلیں اس کی موچکوں سے
 نیچے کی طرف ٹک کر رزنے لگیں۔ یہ نے سائیکل قریب کی ایک دیوار کے ساتھ
 ٹکرا کر کوڑی کر دی۔ گھنٹری بھی اس پر ٹک دی جیسا کہ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا
 میں اس سے اس قدر انوس ہو چکا تھا جیسے ہم برسوں کے واقف ہوں۔ میں ایسے
 غم سے کہ ہاتھ کا آئندہ ہم زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ اس نے اپنے بے مکلفانہ
 چہرے میں پوچھا کہ اب تو گھر پہنچ جاؤ گے، راستہ تو نہ بھولو گے۔

میں نے شرما کر کہا: جی نہیں، اب میں پہنچ جاؤں گا۔

میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا، لیکن سہجہ سکھ اس بندے کا انکسار
 کیونکہ کھڑوں میں بس کھٹش ہی میں تھا۔ اس نے گھڑی کے شعلے سے موچکوں اور
 وارسی پونچتے ہوئے کہہ اچھا اب تم گھر کو جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔

یہ نے اس کی گھڑی کے شعلوں کی طرف دیکھا ایک کان کے قریب ٹک رہا
 تھا اور دوسرا ہاں میں بلند پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ میں نے سر سے پاؤں تک اس کا
 جائزہ لیا۔ وہ ایک بھاری ستون کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں
 کانوں کے سے ہاتھوں میں میرا کھڑ اور چوٹا سا ہاتھ تمام کر مصافحہ کیا۔ اس طرح
 اس قدر بڑے آدمی سے ہاتھ ملانے میں مجھے فخر محسوس ہوا۔ مجھے یہ خواب میں
 بھی خیال نہ تھا کہ وہ ایک دم دلپس جانے چل جائے گا۔ میں نے کیا کیے تھے
 گھر پہنچے، گھر کے لوگ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

یہ بات سن کر اس نے ایک ٹنگ ٹنگ قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی رکنے ہی میں
 زانی تھی۔ اس نے اٹھل سے پرے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ایک کہتے ہو۔

ہماری مطبوعات

خلیل جبران	پاکل	کار جیلہ دلاڑجے (مضامین)	قوت العین میر
عزت اور جوانی	عزت اور جوانی (مضمون)
کرشن چندر	ایک گدھے کی سرگزشت
.....	پھول کی تنہائی
.....	اشاد رشت	پطرس کے مضامین	پطرس بنامی
.....	عزت کی بات	پطرس کے خطوط
.....	مضامین کرشن چندر	نذیر لب	ضیاء اختر
شائستہ کوش	لذیذہ کچون	حرف آشت
سجاد ظہیر	نقوش زندان	گنجے فرشتے	منشو
جگر آزاد آبادی	کلیات جگر	انارکلی
.....	آتشِ گل	شہنشاہ گوشت
شکیل بدایونی	کلیات شکیل	کریمیں	شفیق الرحمن
سارہ دیوانی	کلیات سارہ	دو ہاتھ	عصمت حنفائی
.....	تغییاں	رات چمدا اور چاند	بلونت سنگھ
فرق گورکھ پوری	گلِ نغمہ	تعمیر حیات	ڈیل کاریگی
		زندہ پتے	خلیل جبران

مکتبہ اردو ادب لاہور